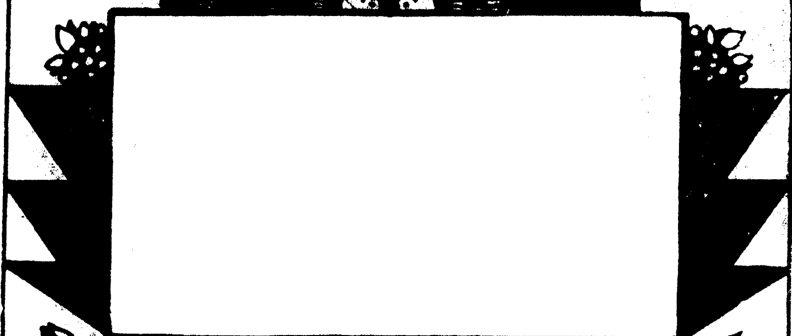
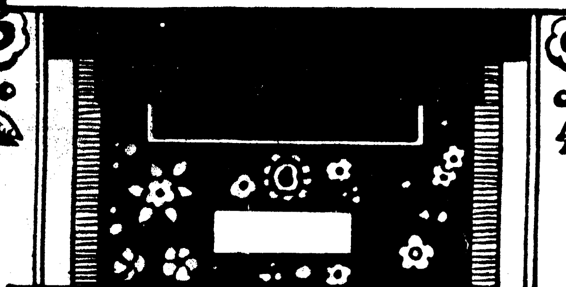
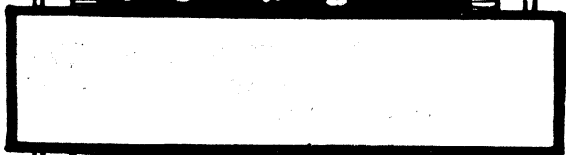
سلسلۂ مطبوعات عصمت نمبر
۹۳













عصمت بک ڈپو دہلی

چھٹی
مرتبہ

سنہ ۱۹۴۴ء



ذچه تارے دیکھ رہی ہے

حقوق محفوظ

دیکھئے صفحہ ۷۴

غدر کی ماری شہزادیاں یعنی بیلہ میں میلہ

فہرست

تصویریں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کل رات کو جب حسینۂ ارضی چادر مہتاب میں لپٹی بے خبر پڑی سوتی تھی، دل وحشی رنگ لایا، چاند کی روشن شعاعیں تیر کی طرح آنکھوں میں گھسیں، دماغ نے راحت وسکون کی بجائے یاد رفتگاں پر رجوع کیا اور آنکھیں زندہ دنیا میں بچھڑی ہوئی صورتوں کی تلاش کرنے لگیں۔ تارے آدھی رات کا نقارہ بجا چکے تھے آہستہ سے اُٹھا اور خاموشی سے چلا، اور ایک بجے کے قریب اس جسد خاکی کو مہندیوں میں پہونچا دیا۔

دل رو رہا تھا مگر آنکھ خاموش تھی۔ کائنات سو رہی تھی لیکن چاند مصروف کار تھا۔ مہندیوں کا وسیع میدان، جہاں کوسوں زندہ انسان کا نشان نہیں، دلّی کا مشہور قبرستان ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز رح کا مقدس خاندان اسی سرزمین میں محو خواب ہے، راستہ آتش ماہ سے دہک رہا تھا، اور خوابگاہ نیم کی خوشبو سے مست و معطر تھی۔ درگاہ میں داخل ہوا تو شکستہ آثار اور کالی کلوٹی دیواریں مسلمانوں کے احساس کی تفسیر کر رہی تھی۔ ایک خاندان کے ان سات بزرگوں کی آرامگاہ مولانا شاہ ولی اللہ رح مولانا شاہ عبدالقادر رح، مولانا شاہ عبدالرحیم رح، مولانا شاہ عبدالعزیز رح مولانا شاہ رفیع الدین رح، مولانا شاہ محمد اسحٰق رح اور وہ محترم ماں جس کے پیٹ سے یہ لال پیدا ہوئے،، آج پردۂ دنیا پر یگانہ روزگار ہے۔ سات سہیلیوں کا آسمانی گُچھا ہر رات ان کے مقدس نام چومتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ ہوا ان کے کارناموں کو گنوا کر اُن پھولوں کو، جو تنا ور درختوں کی سرسبز پتیوں نے اُن مبارک مزاروں پر چڑھائے صاف کر رہی تھی۔

میں دلّی کا رہنے والا ہوں۔ جوانی کی سیاہی اسی سرزمین پر بڑھاپے کی

سفیدی سے بدلی۔ بارہا میتوں کے ساتھ بھی اور فاتحہ کی غرض سے بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے مگر آج تک اس چبوترے پر چڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ تاریخ جس وقت مملکت علوم کے ان تاجداروں اور مذہب اسلام کے ان خدمت گزاروں کی حکومت اور خدمت سامنے لاتی ہے تو جسم کانپ جاتا ہے اور اقلیم سخن کے ان شہنشاہوں کا جلال پاؤں میں زنجیر بنکر پڑ جاتا ہے۔ تھرا جاتا ہوں اور دور سے اس جھنڈے کو سلام کرتا ہوا الٹے پاؤں واپس ہوتا ہوں جو ان مبارک ہاتھوں نے اسلام کی حمایت میں گاڑا اور جو آج بھی اتنا مستحکم و استوار ہے کہ انقلاب زمانہ کی زبردست سے زبردست آندھی اس کو جگہ سے نہیں سرکا سکتی۔

درگاہ سے باہر نکلا تو کچی پکی قبریں ٹوٹی پھوٹی دیواریں، الٹے سیدھے تعویذ، مسلمانوں کی حالت کا آئینہ تھے۔ ان کی صورتیں دیکھتا ہوا باہر نکلا۔ بلّو کے تکیہ سے آگے بڑھ کر کوٹلہ میں دم لیا اور پھرتا پھراتا اس جگہ پہنچا جو بیلہ روڈ کہلاتی ہے "بیلہ روڈ"، ترقی جہاں آباد کا ایک شعبہ ہے۔ برقی لالٹینیں جگمگا رہی تھیں، سڑک موتی کی طرح صاف و شفاف، دونوں طرف خوشنما کوٹھیوں کی قطار، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور کبھی کبھی ایک ہلکی سی آواز کسی چوکیدار یا برقنداز کی۔ "بیلہ روڈ"، کا بورڈ پڑھتے ہی پرانی دلّی یاد آ گئی اور بیلے کی اصل تصویر آنکھوں کے سامنے تھی! "بیلہ"، سرکنڈوں کا ایک گھنا جنگل پچاس سال پہلے جمنا کے کنارے دور تک چلا گیا تھا۔ یہاں دلّی والوں کی کبڈی اور آنکھ مچولی کے تماشے میری آنکھوں نے بھی دیکھے ہیں۔ اور جو رنگ میں دیکھ چکا ہوں جہاں آباد ہزار بار اجڑے اور بسے مگر وہ چیز ختم ہو چکی!

دل بدبخت کی کیفیت الفاظ میں کیونکر ادا کروں۔ چاند آسمان کی گود میں اٹھکھیلیاں کر رہا تھا اور تارے بساط فلک پر اپنے گیلے بکھر رہے تھے۔ میں بھی

وہی تھا اور آسمان بھی وہی لیکن ہائے زمین وہ نہ تھی! بیلا اُجڑ چکا تھا، سرکنڈوں کی جھاڑیں غارت، اور پرندوں کے آشیانے تباہ و تاراج ہو چکے تھے۔ آنکھوں نے نگہ سود کی طرف اس جمنا کو دیکھا جس کے پانی کو دونوں نہیں برسوں بوسے دیئے تھے، مگر آہ جمنا کہاں! وہ نہروں میں تقسیم ہو کر اب ایک تالاب رہ گئی تھی! دل جس کو ڈھونڈھ رہا تھا اس کا کوسوں پتہ نہ تھا!

اس وقت پچاس برس پہلے کی ایک صحبت یاد آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا۔ میں اور میرے پھوپی زاد بھائی مولوی اشرف حسین[1] ایک شام کو مولوی نذیر احمد مرحوم کے ہمراہ گاڑی میں جا رہے تھے منشی ذکاء اللہ مغفور بھی ساتھ تھے۔ موری دروازہ کے پاس پہونچے تو معلوم ہوا بھولو شاہ دبو علی شاہ قلندر کی بسنت ہے۔ جمعرات کا دن تھا۔ دلی نئی نئی تاراج ہوئی تھی مگر دلی والے آٹھویں دن "پیر غیب" پر جمع ہو کر اُجڑی ہوئی دلی کی فاتحہ پڑھ لیتے تھے۔ ہم دونوں بھائی مولانائے مرحوم کے شاگرد تھے گاڑی ایسی جگہ پہونچی جہاں دلی کا مشہور بین نواز رحمت اپنے فن کا کمال دکھا رہا تھا میں نے دیکھا کہ مولانا کی اُستادانہ حیثیت رحمت کے مقابلہ میں مغلوب ہو رہی ہے جو کمزور ہوتے ہوتے اس حد تک پہونچی کہ اُستاد مرحوم نے گاڑی رکوا دی'

دلی! اے دلی! تیری خاک سے کیسے کیسے باکمال پیدا ہوئے اور تیرے ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں فنون کے کیسے کیسے تاجدار دفن ہیں جن کی روشنی ایک دنیا کو جگمگا گئی!! کجا مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ اور کجا رحمت بین نواز! مگر حق یہ ہے کہ کمال اتنا تو ہو کہ کلیجہ توڑ دے۔ دونوں بزرگ اُتر پڑے۔ یہ خبر نہیں کہ کیا دیا۔ مگر نقد بھی دیا اور داد بھی دی۔

گاڑی عصر کے بعد گھر لوٹی اور ہم دونوں بھائی اپنے چند دوستوں کے

[1] جنھوں نے مثنوی میر حسن کو ایڈٹ کیا ہے۔

ساتھ شاموں شام "پیر غیب" پہونچے۔

کیونکر دکھاؤں کہ کیا دیکھا میلے میں میلا اور جنگل میں منگل ہو رہا تھا! آج جہاں بجلی کے خاموش قمقموں پر اُلّو بول رہا ہے یہاں ڈونگ دکانوں کا تانتا تھا! تنبو تنے ہوئے، ڈیرے پڑے ہوئے، خیمے گڑے ہوئے، ہنڈولے لٹکے ہوئے، تن زیب کے مہین مہین انگرکھے، کندھوں پر بسنتی دوشالے ہشّاش بشّاش صورتیں، سُرخ و سفید چہرے، جو تھا وہ ہنستا بولتا، اُچھلتا، کودتا، مگن چلا جا رہا تھا۔

آج اُن صورتوں کا خیال آتے ہی دل بیٹھ جاتا ہے سستا سماں، بےفکری کے دن، مَن بھر کے گیہوں، چار پیسے سیر دودھ، اور دودھ بھی کیسا؟ ملائی کے گھونٹ دن بھر کا اونٹا ہوا، آدھ سیر دودھ میں آدھ پاسے زیادہ روٹی کی روٹی ملائی! دو گھونٹوں میں جی خوش ہوگیا۔ یہ تھیں وہ غذائیں جو آدمی کو آدمی بناتی تھیں، آج کے دلّی والوں کو دیکھتا ہوں، سوکھے چھیٹی دھان پان، آنکھوں میں حلقے، کلّوں میں گڑھے، رزق کے مارے، خوراک کو محتاج، دودھ کو ترستے، گھی کو پھڑکتے!

میں اس کو بھی بسا غنیمت سمجھتا ہوں کہ شہر کے صاحبِ کمال اپنے ساتھ ہی اپنے قدر دان بھی ختم کر گئے اور آج کا بیان "داستان شب" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا!

جس وقت کا یہ ذکر ہے اِن دنوں آدھی رات کے وقت شہر میں ایک صدا گونجتی تھی۔

"سیدی کنور کے باغ کا دانہ"

یہ ایک خوش الحان کنجڑا تھا جو نو بجے رات کو "سیدی قنبر" کے باغ سے کھجوروں کا چھبا لے کر اُٹھتا تھا۔ رات کے سنّاٹے میں جب اِس کی آواز بھنبیری کی طرح جھومتی تھی تو لوگ پروانوں کی طرح گرتے تھے۔ اسی طرح

نوچندی جمعرات کو "بڑیوں کے کٹڑہ" میں عشا کے وقت حسینا کی ان آوازیں ایک خاص امتیاز تھا۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

ہم آگے بڑھے تو شہزادہ مرزا محمد اشرف گورگانی بی اے آئے ان سے باتیں ہو رہی تھیں کہ پھولوں کی آواز کان میں آئی اور مرزا نے کہا۔

"شہزادی" گونج رہی ہے"

اُدھر پہونچے تو بیگو ایک عجیب انداز سے پھول بیچ رہی تھی۔ پٹا پٹی کے گدے، تڑپی ہوئی کیکری کٹاؤ کی جھالریں، چھپیوں پر پڑی ہوئی! توی کا حقہ منہ سے لگا ہوا، نیچے پھول مہک رہے ہیں، اور پنجرے میں اگن لہک رہا ہے! اِدھر پھولوں کی خوشبو ہے، اُدھر تمباکو کی! سامنے قلعی دار پاندان ہے، برابر میں کوری صُراحی! الغرض نفاست اس کی حالت پر اور شرافت اسکی صورت پر قربان ہو رہی تھی! بڑھاپے کی حدود میں سرخ و سپید رخساروں کی جھُرّیاں باآواز بلند قصرِ شباب کی بہار سنا رہی تھیں! ہیں بیگو کے نام سے تو واقف تھا مگر خبر نہ تھی کہ بڑھیا گلفروش کے مُنہ سے بھی پھُول جھڑتے ہیں۔ میر محفوظ علی جو ہمارے ساتھ تھے اور ہم میں شاید سب سے بڑے تھے۔ ٹھٹک گئے اور کہنے لگے

"بیگم! آواز کا کڑاکا اب بھی غضب ڈھا رہا ہے"

بیگو کے خاموش چہرے پر مُسکراہٹ کھلنے لگی۔ اس نے مونڈھوں کو ٹھیک کیا اور کہا "آؤ سید بیٹھو" جب ہم بیٹھ گئے تو بیگم نے جواب دیا۔

"سید بادشاہ! اب کڑاکا کہاں! جوانی اپنے ساتھ سارا کس بل لے گئی! رہا سہا غدر نے اچُور کر دیا! ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں، بدن میں جان نہیں، ڈاڑھیں نکل گئیں، دانت جھول آئے، بدن کا سُکھ۔ جوانی نے توڑا،

ڈھانچ رہ گیا ہے، چاروں طرف لئے پھرتی ہوں! پرسوں چچا کالے ملے نھے مرزا کا طنطنہ یاد ہے؟ محلے والوں کی روح فنا ہوتی تھی، جدھر نکل گئے قیامت آگئی تھانہ دار اور کوتوال تک پناہ مانگتے تھے۔ اب دیکھو کیا رنگ ہے! کمر جھک گئی، طباق سا چہرہ سیپی اور چھاج سا سینہ نکارہ گیا! وہ چونچالی اور خوشحالی سب ہوا ہوئی! جس نے نو من مُگدر کی جوڑی پھول کی طرح اُٹھالی۔ آج پانچ سیر وزن اُٹھانے میں ہانپ رہا ہے! بادشاہ! یہ سب طاقت اور جوانی کے کھیل ہیں۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

"آج کہرام ہے! یہ سامنے والا تنبو دیکھا؟ شہزادیوں کا ہے! بادشاہ کی بھتیجی گوہر آرا بیگم آئی ہیں اور سہیلیوں کو جمع کیا ہے۔ سب اپنی اپنی غدر کی داستانیں سنائیں گی۔ بڑی سرکار ربیعہ بیگم، جہاں پناہ کی صاحبزادی، بھی آئی ہیں اذن عام ہے جو چاہے شریک ہو"

گوہری تنبو

گوہری تنبو کے سامنے والا میدان آدمیوں سے پٹا پڑا ہے۔ بسنتی مقفے ڈال ڈال اور پات پات جگمگا رہے ہیں، قندیلیں روشن ہیں، چراغ جل رہے ہیں اور کافوری شمعیں اِن حسرت نصیب گھڑیوں پر آنسو بہا رہی ہیں۔

گوہر آرا بیگم کی بچھڑی ہوئی سہیلیاں جو کبھی پھولوں میں تُلتی تھیں اور اب پیوندوں میں ڈھکی ہوئی ہیں اس غرض سے جمع ہوئی ہیں کہ اِن بدنصیبوں پہ فاتحہ پڑھیں جن کو وقت نے بھوکا یہاں موت کے گھاٹ اُتار دیا! جب شمع اِن مہمان بیویوں کی ترستی ہوئی آنکھوں کو زندہ صورتیں دکھا چکی۔ اور ایثار مصائب کی یاد نے جو قیامت بپا کی تھی وہ ختم ہوئی تو دل اِن ٹکڑوں کو ڈھونڈھنے لگا جو جیتے جاگتے خاک و خون میں نہائے۔ آنکھیں ڈاڑھیں

مار مار کر روئیں اور داغوں نے نام لے لے کر پکارا۔ مگر زندگی کی گھڑیاں اس تماشے کو روندتی ہوئی آگے بڑھیں! آنے والوں کی مسرت نے جانے والوں کی یاد دل سے بھلا دی، فانوس بزم احباب کو منور کر رہے تھے، محبت کا دور جاری تھا اور پھولوں کی خوشبو ہوا کو معطر کر رہی تھی کہ مہماں نواز خاتون نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

آج بیلا" اور بیلے کی مہمان" دونوں اُجڑ چکے، شہزادیوں کی بزم اور اس کے دور ختم ہوئے وہ رات فجر ہوئی اور اس کے بعد لاتعداد راتیں سر پر آئیں اور گئیں مگر اس رات کا سماں آج تک آنکھوں میں سمایا ہوا ہے اور اب موت کے سوا اس جلسے کو بھلانے والی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔

شاہجہاں آباد اگر تاراج نہ ہو چکا ہوتا تو "بیلے" کی یہ رات حق رکھتی تھی کہ اس کا ایک ایک لمحہ دلّی والوں کے سر آنکھوں پر ہوتا تاریخ ان قیامت خیز واقعات کی پرستش کرتی اور انسانیت کی آنکھیں ان مصیبت ماروں پر جن کی داستانوں نے سننے والوں کے کلیجے دہلا دیئے محبّت کے آنسو گراتیں مگر وقت نے شہر اور شہر کے ساتھ شہر والوں کو اس طرح تباہ کیا تھا کہ عقل و ہوش سب رخصت ہو چکے تھے۔ یہ بھی چند زندہ دلوں کا طفیل تھا کہ زندے مُردوں کے ذکر سے مٹی ہوئی زندگیوں کو تازہ کر رہے تھے۔ میں نے پھولوں شاہ کی اس بسنت میں جو صورتیں دیکھی تھیں اب ان میں سے ایک بھی نظر نہیں آتی اور جو چہرے "گوہری تمبو" میں نظر آئے وہ سب رخصت ہو چکے، اور ایک آدھ باقی بھی ہے تو مُردے سے بدتر، کھٹیا پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔

شہزادہ مرزا محمّد اشرف گورگانی بی اے جو اس صحبت میں ہمارے شریک تھے اور جنہوں نے یہ رات رو رو کر صبح کی تھی اگر زندہ ہوتے تو واقعیا"

شاہزادیوں کا یہ نالہ جو "دو بیلے" کی سرزمین پر بلند ہوا، مرنے نہ پاتا اور فضاء ادب میں ایسا گونجتا کہ سننے والے بھی بلبلا جاتے۔ لیکن بدبختوں کی تقدیر پر کوئی رونے والا بھی نہ رہا اور لاتعداد راتوں کی طرح وہ رات بھی آ ئی گئی ہوئی جس نے خاندان تیموریہ کی ان لٹی کٹی بیگمات کے آنسو اپنے آغوش میں لئے "گوہری تمبو" خلیفہ اکبر کے دنگل میں گاڑا گیا تھا۔ چاروں طرف قناتیں کھڑی ہوئی تھیں اور رات کا تاریک حصہ بجائے دیبا و حریر کے ان مخدرات کے نازک جسم کی پردہ پوشی کر رہا تھا جو قلعہ معلٰے سے نکل کر اس وقت "دو بیلے" کی مہمان تھیں آسمان کے تارے ان کی تیرہ بختی کے شاہد تھے اور زمین بتا رہی تھی کہ یہ شہر پر راج کرنیوالیاں آج دو دو دانوں کو محتاج ہیں! شہزادیوں میں پردہ برائے نام تھا اس لئے تمبو میں داخلہ کی عام اجازت تھی۔ جگہ چونکہ کافی اور میدان وسیع تھا اس لئے چپقلش نہ تھی۔

گوہر آرا بیگم شکریہ ادا کر چکیں تو مہمانوں کے سامنے پانوں کی کشتی آئی کاغذی حقے جو بادشاہ کے ساتھ ہی شہر سے کوچ کر گئے۔ چاروں طرف سلگ رہے تھے کہ ایک بیوی سنبھل کر بیٹھیں اور گوہر آرا بیگم نے فرمایا۔

"یہ ظلِ سلطانی کی خالہ زاد بہن مظفر بیگم ہیں۔ ان کی صورت اب پہچانی نہیں جاتی۔ مگر جنھوں نے "قلعہ معلیٰ کی چہل پہل اور اس مظفر کی رنگ رلیاں دیکھی ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ غدر نے جن کو زندہ چھوڑا ہے ان کو بھی اس طرح بگاڑا کہ حال سے بے حال، اور صورت سے بے صورت کر کے! یہ انار کا سرخ و سپید دانہ آج پھیکا شلجم ہے۔ حق یہ ہے کہ ہم کو اس صورت ہی کے لالے تھے! قربان جائیے اس خدا کے جس نے بچھڑی ہوئی مظفر کو ہم سے ملوا دیا اور یہ صورت پھر دکھا دی! مظفر پر شہر سے نکل کر کیا بیتی

یہ خود سُنائے گی مگر اتنا میں بھی جانتی ہوں کہ ہماری عیش کی گھڑیاں حضور کے دم تک تھیں، ہمارا سہاگ بادشاہ کے ساتھ ختم ہوا۔ جتنا ہنسنا تھا سرکار کے ساتھ ہنس لیئے اب روئیں گے اور اس وقت تک روئیں گے جب تک بدن میں سانس باقی ہے۔"

(۱) شہزادی مظفر سُلطان بیگم کی سرگذشت

رات خاصی ڈیڑھ پہر کے قریب گذر چکی تھی اور گو تمام میلہ میں کچریاں پک رہی تھیں مگر گوہری تمبو والوں کو سانپ سونگھ گیا تھا گویا نماز ہو رہی تھی کہ کھانسنے کھونسنے کے سوا کوئی آواز ہی نہ تھی۔ مظفر سلطان بیگم اب آگے کھسکیں اور چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"ظل سلطانی جن کے سایہ میں ہمارا بچپن کٹا اور جوانی گذری، ہم سے ہزاروں کوس دُور، زندگی کے باقی دن پورے کرکے دُنیا سے رخصت ہو چکے، سرکار کے مبارک ہاتھوں کے نوالے بارہا میرے مُنہ میں گئے ہیں اور حضور نے سینکڑوں ہزاروں مرتبہ میرے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا ہے، مگر یہ تقدیر کی خوبی ہے کہ عالیجاہ پر وقت پڑا اور ولی کی آواز کو ترس گئے تو ہم کسی خدمت کے قابل نہ رہے!"

مظفر سلطان کے منہ سے سرکار کا نام سُنتے ہی سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بادشاہ کی مغفرت کے لئے ہزاروں ہاتھ بلند ہو گئے۔

جب یہ ہو چکا تو مظفر سلطان نے کہا۔

"شہر کی حالت اتنی ابتر ہو گئی تھی کہ ہر طرف کہرام مچ رہے تھے اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں سے رات بھر رونے پیٹنے کی آواز نہ آئی ہو، بھاگنے والے بھاگ چکے تھے اور اب بھی جدھر جس کا مُنہ اُٹھا جا رہا تھا۔ افراتفری ایسی تھی کہ

بھائی کو بھائی کی خبر نہ تھی۔ زندوں کی خیر صلاح تھی نہ مردوں کی خبر۔ اپنوں کا ہوش نہ غیروں کا خیال۔ مغرب کے بعد منشی وزیر مخبر آکر بتا دیتے تھے کہ کل اس کو پھانسی ہوگی۔ سست ہی سست پر جان تھی۔ ایک قدم اُٹھاؤ دوسرے کی خبر نہیں بھاگنے کا رستہ تھا نہ چھپنے کی جگہ۔ دھڑکے میں جان اور کھٹکے میں دل۔ جو پکڑا گیا پھر پلٹ کر نہ آیا! میرے شوہر خسرو مرزا کو دن دہاڑے کوتوالی چبوترہ پر کالے مخبر نے پھانسی دلوائی۔ میں بہتیرا ہی تڑپی اور پیٹی کہ صاحب عالم کی لاش اپنے ہاتھ سے دفن کروں مگر کسی نے نہ سُنی اور یہی کہا کہ جب بادشاہ ہی کے لالوں کو کفن نصیب نہ ہوا۔ تو ہم کس گنتی میں ہیں! مرزا کے بعد جینے کا مزا نہ تھا اور مجھے سب سے بڑا کھٹکا سلیو کا تھا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں کہ دیکھئے اس کا کیا ہوتا ہے۔ میں نے کالے اور اس کی بیوی بچوں کی رات رات بھر خدمت کی کہ کہیں ظالم میرے بچے کا نام نہ لے دے اور مرزا کے ساتھ اس کا داغ بھی نہ اُٹھانا پڑے۔ کالا اصل میں لوہار تھا مگر اس وقت شہر بھر کا مختار تھا اس کی مخبری پر چٹکی بجاتے پھانسی ہوتی تھی۔ پوچھ نہ گچھ۔ اپیل نہ مقدمہ۔ جس دن بھائی فراست کو پھانسی ہوئی ہے وہ رات خدا دشمن کو نہ دکھائے اور میرے واسطے تو قیامت سے کم نہ تھی جب کالے نے کہا کہ "تمہارے بچے کا بھی نام آیا ہے،، میں اتنا سنتے ہی چکرا کر بیٹھ گئی۔ کالا میری حالت پر ہنسا اور کہا "شہر میں بارہ مخبر ہیں اس وقت تو میں نے بچا لیا، مگر ان بے ایمانوں کے منہ کو تو خون لگا ہوا ہے اور مسجد میں قسم کھالی ہے کہ بے لئے اپنے باپ کو نہ چھوڑیں گے تمہارے پاس جو جمع جتھا ہو لے آؤ۔ میں لے دے کر باپ کا نوں خبر نہیں دوڑ کس وقت آجائے،

میرے پاس نقد تو ایک کوڑی نہ تھی جو گہنا پاتا تھا وہ اوپلوں کی کوٹھری میں دبا رکھا تھا۔ مجھے زیور بچے سے زیادہ نہ تھا دوڑی دوڑی گئی اور جو کچھ تھا

کھود، کھاد، اس کے حوالے کیا، مگر دل کا یہ حال تھا کہ گزوں اوچھل رہا تھا اور سب
سے بڑا دھڑکا یہ تھا کہ تبریزی کی بارہ چھوڑ ستائیس ہوگئی تھی مگر مردوں کی سلامتی کی
گھنگھنیاں اب تک نہ اُبلیں۔ کس کی نیند اور کس کی بھوک، آدھی رات اسی چکر
میں بیت گئی۔ مجھے ٹھیک یاد بھی نہیں کہ آدھی تھی یا پچھلا، میں نے سلیمو اور
فرخ دونوں بچوں کو ساتھ لیا۔ سلیمو، ماشاء اللہ پندرھویں، اور فرخ اللہ رکھے
چھٹے برس میں تھی۔ یہ دونوں نیند میں کسمساتے اُٹھے مگر ان کو لے کر کسی نہ کسی
طرح دِلّی دروازے تک پہونچی گوروں اور کالوں کی راؤٹیاں کھڑی ہوئی تھیں
اور لالٹینوں میں ان کی تلواریں اور کرچیں دُور سے جگمگا رہی تھیں۔ قدم بڑھانے
کی ہمت نہ پڑی اور دونوں بچوں کو کلیجے سے لگا وہیں بیٹھ گئی جب میں نے دیکھا
کہ پہرے والے تک بے خبر پڑے ہیں تو بچوں کے مُنہ پر آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونکی
اور دبے پاؤں چوروں کی طرح آگے چلی۔ کیا بتاؤں دِل کا کیا حال تھا! سر پہ
موت تھی اور سامنے وہ موئے برقنداز، مگر اللہ کی کچھ ایسی مہربانی ہوئی کہ میں
پُرانے قلعہ تک پہونچ گئی اور سانس تک کی آواز میرے کان میں نہ آئی۔ یہاں
میں ٹھٹکی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، چاند کی آخر تاریخیں، ہر طرف اندھیرا گھپ
اس پہ یہ خوف کہ صبح کو جو دیکھے گا وہ مار ڈالے گا۔ رستے کا پتہ نہیں کہ کدھر جاؤں
غرض بچوں کو لے کر اسی سڑک پر سیدھی ہولی۔ سُلطان جی پہونچکر مجھے معلوم
ہوا ہم ''نظام الدین'' میں ہیں۔ فرخ نے پانی مانگا مگر میرے پاس پانی کہاں،
اس کو بہلاتی پھسلاتی لئے جا رہی تھی کہ دو آدمیوں کی آواز سُنائی دی جان نکل
گئی اور سمجھی کہ ظالم آگئے۔ سڑک چھوڑ پگڈنڈی پر ہولی۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا
اور جان کا اللہ ہی وارث تھا کہ پو پھٹی اور ایک گاؤں کی سی صورت نظر آئی۔
اب میں نے اپنا بھیس بدلا۔ ڈوپٹہ سر سے باندھا اور سلیمو کی اچکن پہنکر

خاصا اچھا لڑکا بن گئی۔ گاؤں کے پاس ایک ٹوٹی سی مسجد تھی۔ ہم تینوں وہاں
پہونچے۔ ایک بڈھے سے گنوار نے غلط سلط اذان دی اور ہم کو غور سے دیکھ
کر چھوٹتے ہی کہنے لگا۔

"شہر سے بھاگے ہو"

میں نے بھی نماز پڑھی مگر کیا خاک پڑھی۔ دل کا اللہ ہی بیلی تھا۔ سلام
پھر چکی تو بڑے میاں سے کہا "اس لڑکی کو پیاس لگ رہی ہے"
اُنھوں نے ایک میلے کچیلے مٹکے کی طرف اشارہ کیا جو کوٹھری میں رکھا تھا
ٹوٹے ہوئے ٹھکرے سے پانی بھرا اور اوک سے پلایا تو بڑے میاں نے اتنی
مہربانی کی کہ ہم سے کہا "تم لوگ بھوکے ہوگے چلو میں کھانا کھلا دوں"۔ ہم ان کے
ساتھ ہو گئے۔ بھوک کے مارے پتلا حال تھا۔ اِن کے گھر پہونچے تو معلوم ہوا بڑے
میاں بڑھئی ہیں۔ انھوں نے غور سے ہماری صورتیں دیکھیں اور کہنے لگے۔
"مال مصالحہ تو بہت سا لائے ہوگے ہمارا حصّہ تو دلواؤ"۔
میں نے کہا "تلاشی لے لیجئے پھوٹا یا دام بھی پلّے نہیں۔ بھوکے مر رہے
ہیں ہمارے پیٹ بھر دیجئے"۔

بڑھئی خاموش تھا۔ اس کی بڑھیا بیوی اندر سے جا کر تین باسی روٹیاں
اور پیاز کے گٹھے لائی۔ ہم کو وہی غنیمت ہو گئے۔ اس عورت کا دِل ہی دِل میں
شکریہ ادا کر رہی تھی کہ اس نے فرخ کو دیکھ کر کہا۔
"تم کو روٹی نصیب نہیں اس بچّی کو کہاں لئے لئے پھرو گے یہیں چھوڑ جاؤ
پال کرے گی۔ پیٹ پالے گی"۔
میری تو یہ سُنکر جان نکل گئی۔ بڑھیا میری بچّی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف
لے گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

"یہ تو دلّی کی انگنائی ہے، دن بھر گورے کالے آتے رہتے ہیں، تم کو بھاگنا ہے تو جلدی بھاگ جاؤ۔ دونوں کیملے چلے جاؤ، وہ گاؤں بھی اچھا ہے اور بچا ہوا بھی ہے،، میں اس کا منہ تکنے لگی۔ فرخ روئی تو بڑھیا نے اس بُری طرح سے ڈانٹا کہ تو بہ بھلی۔ بڑھئی اپنے کام پر چلا گیا ہم دونوں کھڑے اپنی تقدیر کو رو رہے تھے۔ بڑھیا اپنی لُٹیا لے کر جنگل کو گئی اور میں اپنے دونوں بچّوں کو ساتھ لے ایک طرف ہولی۔ تھوڑی دور جا کر ایک ٹوٹا سا مقبرہ دکھائی دیا گوروں اور کالوں سے زیادہ اب بُڈھے بڑھیا کا ڈر تھا کہ کب آئیں اور کدھر سے آئیں۔ تینوں اس مقبرے میں گھُسے اور دن وہیں گذار۔ بھوکے پیاسے لق لق کرتے، رات کو نکلے تو سڑک پر ایک کوٹھری میں دو مٹکے سے دکھائی دیئے۔ یہ پیاؤ تھی، پیٹ بھر کر پانی پیا۔ لُٹیا بھر ساتھ لی اور آگے بڑھے۔ صبح ہوتے ہوتے "فرید آباد،، پہونچے۔ ہم تھک کر چُور ہوگئے تھے اور پاؤں میں موٹے موٹے چھالے پڑ گئے تھے "فرید آباد،، کے ایک قاضی صاحب نے ہم کو مہمان بھی رکھا اور خاطر تواضع بھی کی مگر یہ کہہ دیا کہ "یہاں زیادہ رہنا ٹھیک نہیں۔ مخبر ادھر بھی آتے جاتے ہیں تم لوگ جلدی کوچ کرو،، میں اتنا سُنتے ہی پریشان ہوگئی اور شام ہی کو وہاں سے چلتی ہوئی۔ دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب "ہیمپا،، پہونچے۔ یہ ہندؤں کا گاؤں تھا ہر طرف سے ہم پر لعنت برسنے لگی۔ بھنگیوں اور چماروں کی طرح ہم کو جھوٹی روٹی کے ٹکڑے ملے اور الگ سے پانی پلایا۔ بھوک میں کواڑ بھی پاپڑ ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرا۔ کہیں میرا ڈوپٹہ سر سے سرک گیا تو ایک موٹے جگادری ہندو نے ڈوپٹہ یہ کہہ کر اُتار لیا۔

"ارے یہ تو عورت ہے!،،

میں چور بنی کھڑی تھی کہ دو تین ہندو میرے دونوں بچوں کو پکڑ لے گئے اور مجھ سے کہا وہ تو مخبر ہے نکل یہاں سے، نہیں تو ابھی سر پھاڑ ڈالیں گے،،
ایک شخص میرا ہاتھ پکڑ مجھ کو سڑک پر چھوڑ گیا اور یہ کہہ گیا کہ اب گاؤں میں قدم رکھا تو جان کی خیر نہیں،،
اب میں کس طرح بتاؤں کہ بچوں سے چھوٹ کر میری کیا کیفیت ہوئی دن بھر بڑ کے نیچے بیٹھی روتی رہی اور خدا خدا کر کے شام ہوئی۔
ابھی رات کی سیاہی پوری چھائی نہ تھی کہ ماتا بڑ کے نیچے سے اٹھا کر گاؤں میں لے آئی۔ جھٹ پٹا وقت تھا، گوالنیں اپنی گائے بھینسوں کا دودھ دوہ رہی تھیں اور آنے جانے والے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ میرا دل ہوا ہو رہا تھا اور دم پر بنی ہوئی تھی کہ اب کسی نے پکڑا مارا اور نکالا۔ تھوڑی دور ایک ٹیلے کے پیچھے چھپی، لیکن یہاں بھی چین نہ پڑا۔ نکلی۔ منہ گاؤں کی طرف کیا مگر ہمت نہ پڑی اور ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ابھی جھٹ پٹا ہی تھا کہ عورتوں اور مردوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں گھی کے چراغ ہاتھ میں لئے مندر کی طرف جانے لگیں شاید کوئی میلہ ہو گا جس کا پورا حال مجھے معلوم نہیں۔ جب مندر کھچا کھچ بھر گیا تو میں اسی گھر میں پہونچی جہاں میں نے اپنے بچے چھوڑے تھے۔ جھانک کر دیکھا تو ایک بڈھا پڑا ہوا حقہ پی رہا تھا اور دونوں بچے سامنے بیٹھے تھے۔ سوچتی تھی کہ کیا کروں، بچوں کو کیونکر بلاؤں مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ دل کڑا کیا جان پر کھیل کر اندر قدم رکھا تو بڈھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے بچوں کو اٹھایا۔ بڈھا اونگھتا ہی رہا اور میں بچوں کو ساتھ لے باہر آ گئی اب چاروں طرف اندھیرا گھپ تھا البتہ مندر سے بھجنوں کی اور جنگل سے گیدڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے میرے دونوں بچے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ مجھ کو اپنی جان

کی پرواہ نہ تھی۔ بچوں کے دھڑکے نے نیم جان کر دیا تھا۔ جسم کی تمام قوت جمع ہو کر ٹانگوں میں آ گئی تھی اور شفقت مادری اس توسن کو مہمیز کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ رات کی سیاہی نے کائنات کا ساتھ چھوڑا اور ہم ایسے پہاڑ کے دامن میں پہونچ جہاں مُرغ کی آواز انسانی آبادی کا پتہ دے رہی تھی۔ بچے بھوک کے مارے بلبلا رہے تھے۔ میں تو خیر دن بھر کی بھوکی پیاسی اعمال کو بھگت اور تقدیر کو رو رہی تھی۔ معصوم بچے نہ معلوم کس گناہ میں پکڑے گئے تھے کہ تن کو چیتھڑا تھا، نہ پیٹ کو ٹکڑا! پاؤں کے چھالوں میں سے پانی اور ہاتھ کی کھڑیچوں سے خون بہ رہا تھا مگر دھجی تک میسر نہ تھی کہ پٹی باندھ دیتی! رات جس نے اپنی زندگی میرے بچوں کی رہنمائی کو وقف کر دی تھی۔ دم توڑ چکی اور دن ہم خانماں بربادوں کے استقبال کو آگے بڑھا مگر رات کی دیوی کا سایہ ہمارے واسطے نعمت تھا جس نے اپنا سیاہ لباس دن کو اوڑھا کر کرۂ دنیا پر ڈھکیلا۔ اس کے خوفناک چہرے میں آفتاب کا کچھ ایسا ذخیرہ چھپا ہوا تھا کہ ننھے مُنے دل دہل گئے اور سلیمو بخار میں لوتھ ہوا اور فرخ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ گاؤں کچھ فاصلہ پر تھا مگر نہر قریب ہی جا رہی تھی۔ اب اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ میں نے اپنی پھٹی ہوئی رضائی املی کے نیچے پانی کے قریب بچھائی اور دونوں بچوں کو وہاں لٹا کر فرخ کا سر دبانے بیٹھ گئی۔ چہرۂ آفتاب کی ترقی کے ساتھ میرے بچوں کے مُکھڑے تمتمانے شروع ہوئے اور ابھی پہلا پہر ختم نہ ہوا تھا کہ سلیمو بالکل ہی بے سُرت ہو گیا۔ رات بھر کا خمار اور پانچ چھ کوس کی تکان، اس پر بھوک اور پیاس! در نہیں گھر نہیں! مجھ پر جو گذری بیان نہیں کر سکتی۔ ہوا ہماری غذا تھی اور املی کی پتیاں ہماری مہمان نواز فرخ نے پانی مانگا میں چلو بھر کر لائی کہ دو جاٹ موٹے موٹے لٹھ کندھوں پر رکھے سر پر آ دھمکے اور پوچھا۔

"تم کون ہو اور یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

میں نے منت سے کہا ہم "مسافر ہیں، تھک کر چور ہو گئے، بچوں کو بخار ہو گیا۔ دم لے رہے ہیں دوپہر ڈھلے آگے بڑھ جائیں گے۔"

ایک جاٹ جس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں بگڑ کر بولا "تم لوگ شہر سے بھاگے ہو۔ ہم کو بھی پکڑواؤ گے جاؤ یہاں سے آگے بڑھو۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "دو بچے بیمار ہیں۔ دیکھ لو بخار چڑھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔ لُو چل رہی ہے، گرمی تیز ہے، اب چلے تو بن آئی مر جائیں گے۔"

اس نے لٹھ زمین پر پٹخا اور کڑک کر کہا "اُٹھا بچوں کو! آگے بڑھ!"

میری روح فنا ہو گئی کہ اگر اس نے میرے لٹھ مار دیا تو پھٹکا بھی نہ کھاؤں گی دو کسی بچے کے پڑ گیا تو سی بھی نہ کر سکے گا۔ فرخ کو گود میں لیا۔ سلیم کو اُٹھایا تو اُٹھا نہ ہو سکا۔ دوسرے جاٹ کو مجھ پر رحم آگیا اور کہا "اچھا بیٹھ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ دونوں چلے گئے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہی بچارا تین موٹی موٹی روٹیاں اور اچار لے کر آیا۔ میں نے اس کو ہزاروں دعائیں دیں۔ بچے تو کیا کھاتے، میں نے ایک روٹی کھائی اور دو رکھ لیں کہ اگر ان میں سے کسی نے ٹکڑا مانگا تو دے دوں گی دوپہر سے پہلے ہی لو کے جھکڑوں نے میرے لالوں کو جھلسانا شروع کیا۔ ہوا کے تھپیڑے منہ پر طمانچے مار رہے تھے اور بخار زدہ معصوموں کے منہ پر پپڑیاں بندھ گئی تھیں۔ آسمان انگارے برسانے لگا اور زمین شعلے اُگلنے لگی، ماتا کی ڈوبی ہوئی آنکھیں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ ایک نگاہ سلیم پر تھی اور دوسری فرخ پر۔ مشکل سے دو کا وقت سمجھ کر، میں نہر پر وضو کرنے بیٹھی کہ وہی رحم دل جاٹ آپہونچا اور اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ارے یہ تو عورت ہے؟"

میں تھرتھر کانپنے لگی کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے، ہزاروں قسم کے خوف تھے مگر خدا اس کا بھلا کرے، میں تو کہتی ہوں سینکڑوں مسلمان اس ہندو پر قربان، مجھ سے کہنے لگا "بہن چل میرے گھر چل"، میں اس کا منہ تکنے لگی اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "ڈرو نہیں تو بہن اور میں بھائی!"
فرخ کو میں نے گود میں لیا اور سلیم کو اس نے پیٹھ پر۔ میں ڈرتی ڈرتی اس کے گھر پہونچی تو اس کی بیوی شوہر سے زیادہ ملنسار تھی۔ بچوں کی طبیعت دوسرے دن ٹھیک ہوگئی اور ان دونوں میاں بیوی نے ایسی محبت سے رکھا کہ اب بھی خیال آتا ہے تو بے ساختہ دعا نکلتی ہے۔ میں ڈیڑھ مہینہ تک اس گھر میں رہی۔ جاٹ جاٹنی نے پردیس کو دیس بنا دیا۔ جب میں نے سُن لیا کہ شہر میں امن ہوگئی تو ادھر کا رُخ کیا۔ بھائی جاٹ خود ہم کو یہاں تک پہنچانے آیا اور میرا رونگٹا رونگٹا اس کو ہر وقت دعائیں دیتا ہے"
مظفر سلطان کی داستان اس قدر دلچسپ اور درد انگیز تھی کہ "بیلہ کا میلہ"، بیلانیوں کی سیر اور دوکانداروں کا کاروبار سب خاک میں مل گیا، جو تھا وہ "گوھری ننبو" میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ کچھ ایسا سناٹا چھایا کہ جو تھا وہ دم بخود! مظفر کا بیان ختم ہوا اور شہزادیوں کے نالے دلّی کے آسمان کا کلیجہ توڑ چکے تو گوھرارا بیگم نے میزبان کی حیثیت میں یہ الفاظ کہے"
"مظفر سلطان نے بتا دیا کہ قلعہ معلیٰ کی بسنے والیاں جنھوں نے گرمی کے دن خس کی ٹٹیوں اور پنکھوں میں گذارے، لُو کے تھپیڑوں اور املی کے پتّوں میں بھی زندہ رہ سکتی ہیں! مگر کون کہہ سکتا تھا کہ خود حضور عالی پر کیا کچھ نہ گذر جائے گی!!"
حضور کا نام زبان پر آتے ہی دلّی والے تڑپ اُٹھے اور "ہائے بادشاہ"

کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہوئے آدھ گھنٹہ سے زیادہ یہ کہرام مچتا رہا
تو شمع زہرا بیگم کے سامنے آئی۔ زہرا بیگم جہاں پناہ کی بھانجی تھیں
وہ ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھیں کہ گوہری تنبو میں یہ آواز گونجی۔

"لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

گوہر آرا بیگم بولیں "خالہ جیتی رہو۔ غنیمت ہے تمہارا دم کہ روتی صورتوں کو ہنسا دیتی ہو"

(۲) شہزادی زہرہ بیگم کی داستان

"بیلے"، کے بازار جہاں تھوڑی دیر پہلے ایسی چہل پہل اور گہما گہمی تھی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے، اس وقت سناٹے میں تھے اور تمام میلہ سمٹ سمٹا کر "گوہری تنبو" میں آگیا تھا۔ گوہر آرا بیگم کا فقرہ ختم ہوتے ہی ایک دفعہ بیگم پھر چہکی اور وہی صدا دوبارہ گونجی۔

"لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

بیگم کے دونوں چھپے موتیا سے چوٹی دار بھرے ہوئے تھے۔ ایک گجراتی دوسرے ہیں دیسی۔ ہوا ان کی خوشبو سے مست ہو رہی تھی اور انسانی دماغ جو بادشاہ کا نام سنتے ہی اپنی بدبخت آنکھوں سے آنسو گرا چکے تھے خاموشی سے جھوم رہے تھے۔ شاہی تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی قلعہ معلیٰ کا سماں یاد آگیا، گذرے ہوئے دن اور بیتی ہوئی راتیں کلیجے پر چھریاں چلانے لگیں۔ لمحہ بھر ہُو کا عالم رہا آخر گوہر آرا بیگم نے پہلے پان کی کشتی مظفر سلطان کے سامنے رکھی اور پھر زہرا بیگم سے کہا۔

"ہاں بیگم اب تم اپنی بپتا سناؤ خدا نے دوبارہ ملوایا ہے، ہم کو تو امید تھی نہیں"

زہرہ بیگم نے ہنسکر گوہرآرا بیگم کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"جس خدا نے بچھڑوایا تھا اُسی نے ملوا دیا۔ میں اپنی داستان کیا سناؤں! دل میں زخم ہیں، زخموں میں ٹیسیں ہیں! شہر جہاں پناہ کے ساتھ اُجڑ گیا۔ اب ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے! خدا کی شان ہے ہمارا قلعہ، جس کی دھوپ میں ہمارا بچپن جوانی سے بدلا اور جس کی چھاؤں میں ہمارے نال گڑے تھے، ہماری آنکھوں کے سامنے ہم سے دیدے بدل چکا اور ہم اس کی صورت کو ترس رہے ہیں، نیم کی پتیاں اور پیپل کی کونپلیں جس وقت ہوا میں سرسراتی ہیں اور یہ ہری بھری شاخیں اور سرسبز ٹہنیاں جب ہوا میں تیرنے والے پرندوں کو اپنی گود میں لیتی ہیں اور آزادی کے گیت گانے والی چڑیاں جس وقت تھرک تھرک کر درختوں پر بیٹھتی اور چہچہاتی ہیں اس وقت دل ہوا ہوتا ہے، کلیجہ کے ٹکڑے اڑتے ہیں شہر آبادی کا سماں وہ دن یاد دلاتا ہے جن کی شام اب صبح کی صورت نہ دیکھے گی زندگی اسی کا نام ہے، تقدیر کا لکھا بھگتنا او بھگتیں گے۔

شہر سے ہم تیرہ عورتیں اور مرد نکلے۔ دونوں وقت کی پھانسیوں۔ ہوش اُڑا دیئے تھے۔ روز ارادہ ہوتا تھا کہ بھاگیں اور جان بچائیں لیکن بڑی چچی جان کا بخار دم بھر کو نہ اُترتا تھا۔ ایک تو ہر وقت چڑھا ہی رہتا تھا اس پر دوسرا اور چڑھتا۔ بڑھاپا اور یہ بخار! ڈھانچ رہ گیا تھا! سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ ان میں خود ہمت نہ تھی کہ اُٹھ کر پانی پی لیں۔ چھوڑ سکتے تھے نہ لے سکتے تھے۔ گورے خالو جان نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح ہو نکلو، مخبر پیچھے لگ گئے ہیں اور کالا نوجوان کا دشمن ہے، کیا خبر کس کس کو پھانسیاں دلوائے آج چچا جان کو بھی پکڑوا دیا۔ بلا سے آپا جان کو کندھے پر ڈھوئیں گے مگر موت کے منہ سے تو نکلیں گے، اور اگر آ ہی گئی ہے تو خدا کی مرضی!

بارہ بج چکے تھے جب ہم گھر سے نکلے۔ کھانا پانا پہلے ہی ختم ہو چکا تھا، برتن
بھانڈا اور کپڑا لتّا زمین کھود کر دبا دیا اور بھرا ہوا گھر خدا کے سپرد کر، جدھر منہ اُٹھا
چل کھڑے ہوئے۔ خالو جان نے اپنی پیٹھ پر چچی جان کو لیا، وہ بخار میں ہل ہلا
رہی تھیں۔ اِن کی ''ہائے ہائے'' نے اور بھی دم ناک میں کر رکھا تھا۔ ''آغا مرزا''
بھی ساتھ تھے۔ وہ کہتے تھے ہُوں کی آواز نہ ہو۔ چچی جان کی کھانسی لمحہ بھر کو
چین نہ لینے دیتی تھی۔ راج گھاٹ پر پہونچ کر ہم سب ٹھٹکے۔ پار جانا تھا اور بیچ
میں جمنا لہریں لے رہی تھی۔ کیسی مصیبت کا سامنا تھا، اندھیری رات اور
بچے ساتھ! ''گورے خالو'' مچھلی کے شکار کے دھتیا تھے، دریا کا چپہ چپہ ان کا دیکھا
بھالا تھا۔ وہ دُور تک اپنے ساتھ لے گئے اور ''گھمو'' کے پاس جا کر کہا۔ لو اُترو یہاں
پانی ٹخنے ٹخنے ہے'' کیا بتاؤں دریا کیونکر پار کیا۔ پوری منزل طے کی اور پھر قلعہ
ہی کے پاس تھے۔ بچوں کو گود میں لیا مردوں کا ہاتھ پکڑا اور ایک ایک کر کے اُدھر پہنچے
''منجھلی نانی اماں'' سب سے زیادہ بیکار رہی تھیں۔ اِن ہی کا پاؤں رپٹا
اور دھڑام سے گریں مختصر یہ کہ خدا خدا کر کے پار پہونچے۔ بچے کپکپا رہے تھے
چچی جان کی کھانسی نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا کہ کتے بھونکتے ہوئے ہماری
طرف آئے۔ خالو جان نے لکڑیاں پٹخاریں اور ہم سب ایک طرف کھڑے
ہو گئے۔ گھڑی گھنٹہ تو ہمارے پاس تھا نہیں۔ کوئی تین بجے ہوں گے۔
''آغا مرزا'' نے کہا ''چلو جلدی کرو ابھی شہر ہی میں ہیں۔ صبح ہو رہی ہے کسی
نے دیکھ لیا تو یہیں ڈھیر ہوں گے'' ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ مجھ کمبخت
کے پاؤں میں ڈھیلا پاجامہ تھا۔ بھاگی تو بھاگا نہ گیا، سب سے پیچھے رہ گئی اور
جب سب نکل گئے تو چلائی کہ خدا کے لئے ٹھہرو میں بھی آ رہی ہوں، ہم لوگ
مشکل سے دو کوس گئے ہوں گے کہ صبح ہو گئی اور ایک گاؤں میں پہونچے

یہ ”بڈھا گر گڈھ“ تھا ہندو مسلمان دونوں آباد تھے۔ اِن لوگوں کو ہم تماشہ ہوگئے جو آتا دو چار باتیں بناتا اور ہنسی اُڑاتا۔ بھوکے بھی تھے۔ پیاسے بھی تھے۔ ایک گوجر نے لٹھ پھرا کر کہا ”یہ بھگوڑے ہیں ان کو شہر لے چلو انعام ملے گا“۔ ہماری تو یہ سُن کر جان نکل گئی مگر وہ اصل میں مذاقیہ آدمی تھا کیونکہ اسی شخص نے سب سے زیادہ ہمدردی کی اور دوپہر کا کھانا اسی نے کھلایا۔ دن پہاڑ ہوگیا کہ کسی طرح گھٹتا ہی نہ تھا اور ہم اس فکر میں تھے کہ ذرا جھٹ پٹا ہو اور آگے بڑھیں۔ گاؤں والوں نے ہم کو پریشان نہیں کیا اور ہم نے جس طرح ممکن ہوا دن بسر کیا۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھیں مگر مصلحت یہ نہ تھی شام ہوتے ہی چل پڑے۔ بچّے نیند کے جھونٹوں میں جھوم رہے تھے اور بڑوں کی بھی حالت کچھ اچھّی نہ تھی۔ دس بجے ہوں گے کہ چچی جان کو بخار چڑھا۔ گرمی کے دن تھے لحاف رضائیاں ساتھ نہ تھیں۔ بخار سردی سے آیا۔ سب ان کو لپٹ گئے مگر کپکپی کسی نہ کی تھمی۔ اس پر طرّہ ان کی پیاس تھی۔ وہاں پانی کہاں؟ ایک لٹیا میں ”توتلی پھپی جان“ کے بچّہ کے واسطے دو گھونٹ ساتھ لے گئے تھے وہی کام آئے مگر اس سے کیا ہوتا؟ آخر ایک درخت کے نیچے بچھونے بچھائے اور سوچا کہ یہاں دم لیں۔ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے، تندرست کی خبر رہی نہ بیمار کی، آنکھ کھلی تو سورج سر پہ تھا مگر سامنے ہی ایک ٹوٹا ہوا گنبد تھا۔ بھاگ کر وہاں جا چھپے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ آکا اور خالو باہر نکلے۔ گاؤں بہت دُور تھا، ہم نے ان کو نہ جانے دیا، بچّے بھوک کے مارے بلبلا رہے تھے اور خود ہماری انتڑیاں بھی قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں، مگر کچھ کر سکتے تھے نہ ہو سکتا تھا۔ رات سر پہ آگئی اور گیدڑوں کے غل غپاڑے کے ساتھ

بچوں کی چیخم دھاڑ نے اور بھی قیامت بپا کی۔ آگے بڑھے مگر بدن میں سکت نہ تھا۔ بچوں کو گودوں میں لیا، خدا کی قدرت یاد آتی ہے کہ وہ کس طرح تماشہ دکھاتا ہے۔ دور فاصلہ پر ایک دھندلی سی روشنی نظر آئی۔ ہم ایک کونہ میں بیٹھ گئے اور دونوں مرد وہاں پہونچے تو وہ چنے کی دوکان تھی وہ چنے پلاؤ بن گئے۔ چنے والا بھی بھلے مانس تھا۔ چنے بھی کھلائے پانی بھی پلایا ذرا پیٹ میں پڑی تو آگے بڑھنے کی سوجھی، مگر ادھر دیکھتے ہیں تو چچی جان ٹھنڈی برف پڑی ہوئی ہیں۔!

آکا نے دیکھ کر کہا "ان کی نبضیں بھی جا چکیں"، جھنجوڑا آوازیں دیں لیکن ان کو ہوش نہ تھا۔ حالت لحظہ بہ لحظہ غیر ہو رہی تھی، اندھیرا گھپ، صورت بھی نہ دکھائی دیتی تھی، سانس سنا تو وہ بھی کچھ ٹھیک نہ تھا، مختصر یہ کہ گھڑا بولنے لگا

میں سمجھتی ہوں دنیا میں اس سے زیادہ دردانگیز موتیں کم ہوں گی شہد اور دوا تو درکنار، پانی تک نصیب نہ تھا۔ یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کب گذریں اور کیونکر گذریں! خالہ سکند رنے کہا ہو چکیں"، میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ مر بھی گئیں یا نہیں۔ راتوں رات گڑھا کھود کر وہ بھی کس طرح، کنٹلوں سے الٹا سیدھا، ان ہی کے کپڑوں میں جو بدن پر تھے دبا دیا اور روانہ ہو گئے۔

صبح ہم کو "دکیانی" میں ہوئی۔ یہ مسلمانوں کا گاؤں تھا اور یہاں "آکا میاں"، کے ایک دوست رہتے تھے۔ وہ ہم سب کو گھر لے گئے۔ اپنی ذات سے بہت نیک آدمی تھے۔ لیکن ان کی بیوی ایسی دماغ چوٹی تھی کہ خدا کی پناہ! سیدھے منہ بات کرنی ہی قسم تھی۔ نیک بخت نے بیسنی روٹی پکائی گھی کی ہنڈیا پاس تھی کھایا۔ بچوں کے ہاں بھی لگایا، مگر ہم کو روکھی دی۔ میں نے کہا اچار ہوتا تو اچھا تھا۔ املی اور لہسن کی چٹنی سامنے لا رکھ دی۔

ہم دو دن اور رات وہاں ٹھیرے مگر اس کی بد مزاجی سے بہت پریشان ہوئے اور تیسرے دن آگے روانہ ہو گئے۔"

یہاں تک پہونچکر زہرہ بیگم خاموش ہوئیں۔ پانوں کی نھالی اپنے آگے گھسیٹی اور مسکرا کر گوھر آرا بیگم سے کہا "آپ کے آج کے میلے نے تو اچھّے اچھّے مشاعروں کو مات کیا کہ جہاں تک نظر جاتی ہے آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے ہیں۔"

گوھر آرا بیگم بولیں "بیوی یہ بھی کوئی دن کی بات ہے۔ چند روز بعد شہر اور شہر والے ان رنگوں کو بھول بسر جائیں گے۔ نئے نئے لوگ ہوں گے، نئی نئی باتیں ہوں گی۔ دیکھو بادشاہ کے کیسے کیسے جاں نثار جو پسینے پر خون بہانے کو تیار تھے۔ خون کے پیاسے ہو گئے اور نمک حراموں نے جھوٹی گواہیاں دیں! ابھی اعلیٰ حضرت کا نام زندہ ہے کہ ہم جیسی لونڈیاں موجود ہیں۔ ہمارے بعد کوئی نام بھی نہ لے گا! جس کے قدموں سے دلّی اور دلّی والوں نے آنکھیں ملیں، اس کی روح فاتحہ کو ترسے گی اور دو روٹیاں بھی نصیب نہ ہوں گی! سچ پوچھو تو بیلہ میں میلہ اور جنگل میں منگل تمہارے دموں سے ہوا اس "کمبو" میں کون آتا اور یہ چہل پہل ہوتی۔

ہائے تقدیر! اچھی جان غریب کو کفن نصیب ہوا نہ قبر ملی۔ ان ہی کپڑوں میں خدا کے سامنے بھی گئیں! دیکھو خدا اپنی قدرت کے تماشے کس طرح دکھاتا ہے کیسی نازک مزاج بیوی تھیں بچھونوں پہ سلوٹ ہوتی تھی تو ناک بھوں چڑھا لیتی تھیں یہ خبر نہ تھی میّت کو غسل بھی نصیب نہ ہوگا۔"

زہرہ۔ "واجی حضرت غدر نے جو مصیبت زندوں اور مردوں پر ڈالی ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ خیر وہ تو مر کر سب بلاؤں سے چھوٹ

گئیں، زندوں کو فرمائیے کہ اُن پر کیا گذر رہی ہوگی، اور بھولے بھالے لال جب بلوں بلوں کرتے ہوں گے تو ماں کیا کہتی ہوگی؟"

گوہر آرا بیگم "ہاں بیوی سچ کہتی ہو، مگر جب صاحب عالم جہاں پناہ ہی پر ایسی گذری کہ آسمان اور زمین کانپ گئے اور بھوکے پیاسے گھر سے رخصت ہوئے تو ہم لونڈی غلام کس گنتی میں؟"

ابھی گوہر آرا بیگم کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک متفقہ آواز بلند ہوئی اور لوگوں نے تقاضا کیا کہ "آگے فرمائیے"۔

زہرہ بیگم نے ہنسکر کہا "بہت اچھا" پھر وہ سنبھلیں اور کہنے لگیں:۔

"تیرہ آدمیوں سے ایک تو اللہ کو پیاری ہوئیں اب ہم بارہ آدمی تھے۔ دوپہر کے وقت ایک بڑ کے درخت کے نیچے ہم ذرا ستائے۔ گاؤں یہاں سے قریب تو نہ تھا مگر دکھائی دے رہا تھا۔ پیاس کے مارے پپڑیاں بندھ رہی تھیں کہ ایک طرف سے گانے کی آواز آئی۔ یہ لاؤ والوں کی صدائیں تھیں۔ کیا بتاؤں عید کے چاند کی بھی اتنی خوشی نہ ہوگی جتنی اس وقت اس روز کی ہوئی۔ ہم سب لپکے، مگر مردوں نے ہم کو روکا اور خود گئے لاؤ والا بیچارہ کوئی شریف آدمی تھا، اس نے ایک گھڑا پانی بھر دیا اور آ کا نے آکر ہم سب کو پلایا۔

بچوں نے پھر رونا شروع کیا اور بھوک سے بلکنے لگے مگر ہو ہی کیا سکتا تھا؟ آخر "ماموں جان" گاؤں کی طرف گئے اور خدا جانے بھیک مانگ کر یا اپنی داستان مصیبت سنا کر چار روٹیاں اور دو گٹھیاں پیاز کی لے کر آئے اور ٹکڑا ٹکڑا سب کو دیا۔

بریانی متنجن میں بھی یہ مزہ کبھی نہ آیا ہوگا جو اس وقت کے ٹکڑے میں آیا۔ کھا پی، آگے بڑھے بچوں کے پاؤں سوجھ گئے تھے اور خون نکل رہا تھا

مگر کیا کر سکتے تھے، اسی طرح چلے گئے۔ شام کے قریب ”گوہانہ“ کے پاس ایک گاؤں میں پہونچے۔ یہ مسلمانوں کا تھا اور یہاں کا جو مکھیا تھا وہ سانس کے مرض میں بیمار تھا۔ دنیا بھر کے علاج کرڈالے مگر کسی طرح آرام نہ ہوا۔ اتفاق سے اس کا ایک نوکر کنوئیں پر پانی بھرنے آیا۔ ہم لوگ بھی وہیں ٹھہرے تھے۔ خدا کی قدرت عجیب ہے، وہ ایسے تماشے دکھاتا ہے کہ عقل دنگ ہو جاتی ہے۔

نوکر نے کسی آدمی سے اپنے مالک کی حالت بیان کی ”گورے خالو“ جنہوں نے عمر بھر شکار کھیلا اور کچھ نہ کیا۔ دمہ کی دوا جانتے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ”دو تین دن میں دھوئیں کی طرح نہ اڑ جائے تو توپ کے منہ اُڑا دینا“ اس نے جا کر گھر میں ذکر کیا۔ اُسی وقت وہاں سے دو آدمی ہم کو لینے آ گئے اور خوب آؤ بھگت ہوئی۔ دونوں وقت دودھ اور گھی کی نہریں بہتی تھیں گورے خالو تو حکیم جی بن گئے اور سارا گاؤں اِن کے قدم لینے لگا۔ دو مہینے تک ہم وہاں رہے، جب ہم چلنے کا نام لیتے گاؤں والے روک لیتے۔ آخر خدا خدا کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔ دو بڑی بیل گاڑیاں انھوں نے ہم کو دیں اور ایک آدمی یہاں تک ساتھ آیا۔ کھانا اس قدر ساتھ تھا کہ دس اور ہوتے تو کافی ہو جاتا۔

ہم یہاں پہونچے تو امی جی ہو چکی تھی مگر گھر کے گھر سنسان ہو چکے تھے اور بعض محلّے تو ایسے اُجڑے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ گدھے کے ہل پھر گئے! قلعہ کو دیکھ کر کلیجہ پر سانپ لوٹتا تھا۔ باہر کی دیواریں دیکھ کر اندر کی عمارتوں پر فاتحہ پڑھی اور صبر و شکر سے رہنے سہنے لگے مگر دل پر جو گذری اور گذر رہی ہے وہ دل ہی جانتا ہے کیسے کیسے جوان

برابر کی سہیلیاں اور ہمجولیاں آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں کہ دل ڈھونڈھ رہا ہے لیکن حضور ہی نہ رہے تو کس کے عزیز اور کہاں کی بھنیلیاں۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!"

زہرہ بیگم ٹھٹکیں، تو گوہر آرا بیگم کے اشارہ سے شمع قمر زمانی بیگم کے سامنے آئی۔ یہ صاحب عالم کی بھانج ہوتھیں۔ ان کے شوہر محمد شاہ اور ایک جوان لڑکا غدر میں مارے گئے جب کالا مخبر قسم کھا گیا کہ دم میں دم ہے تو باقی دونوں لڑکوں کو پھانسی دلواؤں گا، تو شہر سے بھاگیں۔

(۳) شہزادی قمر آرا بیگم کی بپتا

گوہر آرا بیگم نے کہا۔ "قمر بوا! اب تم اپنی بپتا سناؤ کہ یہ سب مشتاق ہیں"، تو انھوں نے آنسو پونچھے اور کہنے لگیں۔

"جب مرزا صاحب اور بچہ اللہ کو پیارے ہوئے تو میری حالت دیوانوں کی سی تھی۔ کالے نے میرے بے گناہ بچہ پر ستم توڑا، اس کا بدلہ اس کو مل گیا۔ چالیس دن کے اندر ہی اندر ایسا تاراج ہوا اور ایسی پڑی کہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ جب وہ میرے بچوں کی فکر میں تھا تو میں ایک دن دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑ باہر نکلی، بھرا گھر تھا مگر کیا کیا لیتی! برتن بھانڈ اکبر اللہ زمین میں گاڑھ، جدھر منہ اُٹھا چلتی ہوئی، بڑی خرابی یہ تھی کہ رات کو نکلنی تو رستہ کا پتہ نہ تھا اور دن کو جاتی تو پکڑا دھکڑی ہو رہی تھی۔ جھٹ پٹا ہو رہا تھا کہ میں نے دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑا، مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ لاہوری دروازہ ہے یا کابلی۔ بڑے لڑکے سنے، جو

اللہ رکھے اب گیارھویں میں ہے، بتایا کہ یہ اجمیری دروازہ ہے" گوروں کا پہرہ اور ان کی کرچیں اور تلواریں دیکھ کر جان نکل گئی۔ چھوٹے نے کہا۔
"امّاں بوی! کھائی کھائی چلو۔ کھڑکی میں سے نکل جائیں گے"
مجھ کمبخت کو کیا خبر کہ کھائی کہاں ہے اور کھڑکی کدھر! اس کے پیچھے ہو لی۔ وہ تھا بچہ مگر سچّا تھا۔ چلتے چلتے ایک ٹوٹا دروازہ ملا۔ اسی کو کھڑکی کہتے تھے۔ یہاں بالکل سنّاٹا تھا۔ ہم باہر نکلے تو خاصی دو ڈیڑھ گھڑی رات گذر چکی تھی اور چاندنی اچھی طرح نکل رہی تھی۔ بڑے نے کہا یہ اِدھر تو "نظام الدین" ہے اور اُدھر "گوڑگانوہ"، ہم نے "نظام الدین" کی سڑک چھوڑ دی اور "گوڑگانوہ" کی طرف ہو لئے۔ ابھی تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ اِدھر سے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز آنی شروع ہوئی۔ بس دم نکل گیا۔ بچوں کو لے کر ایک پیپل کے درخت کے پیچھے جا چھپی۔ تو تین گورے سرپٹ گھوڑے دوڑائے جا رہے تھے۔ کاٹھیوں میں کبوتر اور فاختہ، پِچھے اور خبر نہیں کیا کیا پرندے بندھے ہوئے تھے۔ یہ شکاری لوگ تھے۔ وہ نکل گئے تو جان میں جان آئی۔ آگے بڑھی تو چھوٹا ننھا کہنے لگا "ہم تو تھک گئے اور بھوک لگ رہی ہے"۔ میں اپنی افراتفری میں روٹی لینی بھول گئی، نہیں تو دو روٹیوں میں گھی لگا، لون ڈال لیتی، اس کو بہلاتی پھُسلاتی چلی جا رہی تھی اور دل ہوا ہو رہا تھا کہ موئے گیدڑوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ چاند کی شروع تاریخیں، گھنٹہ دو گھنٹہ کی بہار دکھا کر، چندا ماموں نے بھی ساتھ چھوڑا۔ اب ہم تین دم، جنگل کا سنّاٹا اور ہوا کا فرّاٹا! برقع میں جو ہوا بھری تو کپّا ہو گیا! بہتیرا ٹھیک کرتی ہوں مگر وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ خدا خدا کرکے اُتارا۔ اور چلی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو چھوٹا سڑک پر بیٹھا منہ بسور رہا ہے کہ روٹی دو۔!

میں نے بہتیرا ہی سمجھایا۔ بڑے ننھے نے چمکارا، مگر وہ قبضہ میں نہ آیا۔ مچل گیا۔ چلّانے لگا۔ یہ بھی خدا کا شکر تھا کہ کوئی سننے والا نہ تھا۔ آخر تڑپ تڑپ کر بچّہ سو گیا تو بڑے نے پیٹھ پر لادا اور پھر آگے بڑھے۔ صبح ہوتے ہم شہر سے چار کوس دور نکل گئے۔ یہاں کسی زمانہ کا ٹوٹا ہوا ایک مدرسہ تھا اور اُس کے پاس ہی گاؤں بھی تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا ایک تالاب بھی نظر آیا۔ میں نے وضو کیا اور مدرسہ میں آکر نماز پڑھی۔ بڑے کا انگرکھا اُتار کر ایک گوشہ میں بچھایا تو نیچے کنکر تھے۔ ہاتھوں سے ان کو صاف کیا اور جھاڑ و دے دلا انگرکھا بچھا دونوں کو اس پر لٹا دیا۔ وہ دونوں رات بھر کے تھکے اور جاگے ہوئے سو گئے تو مجھ کو یہ خیال ہوا کہ چھوٹا اُٹھتے ہی روٹی مانگے گا۔ برقع اوڑھ باہر نکلی اور سامنے ایک گھر میں جاکر سوال کیا تو ایک بڑھیا باہر نکلی اور مجھ سے پوچھا کہ "تو کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟" میں اس سے کھڑی باتیں کر رہی تھی کہ ایک جوان سا آدمی میرے قریب آکھڑا ہوا اور ڈانٹ کر کہا "تو شہر سے بھاگی ہے ہم تجھ کو پکڑ کر شہر پہونچائیں گے" خدا معلوم وہ کمبخت کیا کرتا کہ اور دو چار آدمیوں نے آکر اس کو دھمکایا اور میری پوری کیفیت معلوم کر کے مجھ کو چار روٹیاں اور مٹھا دیا۔

میں مٹھا اور روٹی لے کر مدرسہ آئی تو چھوٹا بچّہ بے خبر اور بڑا بیٹھا میری راہ دیکھ رہا تھا۔ ایک روٹی تو میں نے بڑے کو دی اور ایک آپ کھائی۔ اتنے میں چھوٹا بھی اُٹھ بیٹھا۔ اِس کے آگے رکھدی۔ ہم کھانا کھا رہے تھے، دیکھتے کیا ہیں کہ "خالہ سردار" کی بیٹی بی خوبن لڑکتی پڑکتی چلی آرہی ہیں۔ میری تو جان میں جان آگئی کہ پردیس میں خدا نے فرشتہ بھیجدیا۔ خوبن عورت تھا آفت کا پرکالا تھی۔ آتے ہی مارے ہنسی کے پیٹ میں بل ڈال دیئے۔

میں بھی ساری بپتا بھول گئی۔ ایک روٹی اس کو دی۔ روٹیاں موٹی موٹی تھیں اور ایک بہت تھی۔ دونوں بچوں نے تو اس میں سے بھی ٹکڑا چھوڑ دیا۔ کھا پی چکے تو بھلا خوبن کیا نچلی بیٹھنے والی تھی۔ میں نے بہتیرا کہا کہ چپکی بیٹھ جا۔ مگر وہ کیا ماننے والی تھی کہنے لگی میں تو سارے رستے ہی اچھلتی کودتی آئی ہوں۔ میرے ساتھ چار اور ہو تے تو پیٹ بھر دیتی چل تو کھڑی ہو۔ میرے ساتھ چل۔

میں اس کے ساتھ ہولی وہ ایک ایک گھر میں سُنگنیاں لیتی تھی ایک گھر میں سے کسی بیمار کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہاں کان لگا کر دیر تک سُنتی رہی اور پھر اس زور سے کنڈی بجائی کہ میں ڈر گئی ایک بڈھا اندر سے نکلا تو کڑک کر کہنے لگی۔

"بیمار کا کیا حال ہے اب تک آرام نہیں ہوا" وہ آدمی ہکا بکا ہو کر رہ گیا اور کہنے لگا "جی تم کون ہو" گھر مسلمان کا تھا۔ بی خوبن نے زور سے کلمہ پڑھا اور کہا۔

"ہم کو کیوں پوچھتا ہے۔ فقیر ہیں۔ حکم ہوا۔ آ گئے۔ صبح آگے بڑھ جائیں گے۔ جلدی بتا کیا حال ہے"

بڈھے نے غور سے صورت دیکھی تو بی خوبن نے زور زور سے الحمد پڑھنی شروع کی اور کہا۔

"دیکھنا کیا ہے۔ دوا بھی لے دُعا بھی لے۔ دُور۔ دُور۔ بیماری دُور۔ بول کیا حال ہے اور دیکھ۔ سات دِن میں تیرے گھر پر بلا نازل ہونے والی ہے، آگ لگے، مُردہ نکلے، ڈھور مرے، سناؤنی آئے، بیمار کو دم کا پانی دے، جا جا، دُور، بلا دُور"

بڈھا سوچتا ہی رہا کہ کیا کرے اتنے میں اندر سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت دروازہ میں آئی اور کہنے لگی "کیا ہے" بڈھے نے جواب دیا۔

"ہے کون۔ اللہ نے اپنے مہمان بھیجے ہیں۔ آجا۔ کوئی مرد نہیں ہے" میں اب تک تو سہم رہی تھی مگر اب مجھے بھی ہنسی آنے لگی۔ خوبن نے عورت کی صورت دیکھتے ہی کہا۔

بیمار کا یہ حال کر دیا۔ اچھا اب بھی ہشیار رہو۔ مسجد میں چراغ جلا دور، دور، بلا دور"

خوبن نے اتنا ہی کہا تھا کہ عورت قدموں میں گر پڑی اور کہنے لگی۔ میرا لڑکا بخار میں لوتھ پڑا ہے اندر چل کر دیکھ لو" مرد بولا "مائی جی کہتی ہیں بلا نازل ہونے والی ہے"، عورت تو اتنا سنتے ہی خوبن کے آگے ہاتھ جوڑ کھڑی ہوگئی کہ "رحم کرو"

میرے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے اور خوبن اکڑ رہی تھی "دور، دور دور" کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عورت اور مرد دونوں سامنے آ کھڑے ہوئے ایک نے ہاتھ جوڑے ایک نے پاؤں پکڑے۔ اِن کے کہنے سُننے اور منت خوشامد سے خوبن کلمہ درود پڑھتی ہوئی لوٹیں۔ مجھے اُنھوں نے ہدایت کردی تھی کہ پیچھے پیچھے رہوں اور ہاتھ جوڑے رہوں۔ وہ دونوں میاں بیوی بھی ان سے دو قدم پیچھے میرے ساتھ تھے۔ خوبن گھر میں داخل ہوئیں تو عورت لپک کر آگے بڑھی اور چراغ دکھایا۔ باہر کے چھونپڑے بیمار پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا یہ ایک جوان لڑکا تھا اور بخار چڑھا ہوا تھا خوبن نے جھوٹ موٹ نبض دیکھی اور زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔

" ڈھائی سیر خشکہ، ڈھائی سیر گھی۔ ڈھائی سیر دہی۔ ڈھائی سیر کھانڈ

ابھی تیار کرو۔ اس کا بخار میں لے لیتی ہوں،، اتنا سُنتے ہی دونوں ماں باپ کی جان میں جان آ گئی، یہ ترکیب خوبن نے اس وقت کی جب دیکھ لیا کہ پنڈا پسیج رہا ہے اور بخار اُترنے والا ہے۔ گاؤں میں کیا کمی تھی سب سامان آ گیا خوبن نے اس میں سے دو نوالے کھائے اور آواز لگائی۔

”دُور دُور بَلا دُور۔ بخار دُور،،

چل چل اس کے پاس سے چل۔ آ آ آ میرے پاس آ،،

مریض کا بخار اُتر ہی رہا تھا بی خوبن خشکہ لے وہیں مدرسہ میں آئیں اور ہم سب نے مل کر کھایا اور پڑ رہے صبح ہوتے ہی عورتیں اور مرد ٹھٹ کا ٹھٹ موجود تھے کہ ”بیرانی جی کہاں ہیں،، میرے فرشتوں نے بھی یہ سوانگ نہ دیکھے تھے۔ میں نے تو کہدیا ”بوا خوبن میرے بس کا روگ نہیں مگر بڑا نہا اس کے ڈھب پر چڑھ گیا۔ ایک لکڑی لے کر باہر بیٹھ جاتا اور جہاں لوگ آوازے کہہ دیا۔

”ٹھہر جاؤ پیرانی جی نماز پڑھ رہی ہیں،،

چار پانچ دن میں سارا گاؤں بی خوبن کے قدموں میں تھا مجھ کو تو ایسے کھانے ملے کہ میں قلعہ بھی بھول گئی۔ روز مُرغ پکتے تھے۔ کیونکہ خوبن جو تعویذ لکھتی تھیں وہ مُرغ کے خون سے، دُور دُور کے لوگ آنے لگے اور بی خوبن کی وہ پُوجا ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ مدرسہ میں تو ہم کوئی آٹھ دس ہی دن رہے اس کے بعد ایک بہت بڑا مکان جو بارہ دری کے نام سے مشہور تھا ہم کو مل گیا۔ کھانا تو ہم کو کبھی پکانا پڑا نہیں اور چاروں طرف سے اتنا آتا تھا کہ ہم جیسے بیس آدمیوں کو کافی ہوتا۔ دونوں وقت دو مٹکے دودھ کے آتے تھے۔ خوبن کے صدقہ میں ہماری بھی عزت ہو گئی۔ پیرانی جی تو ایسی بچیں کہ

آس پاس کے گاؤں بھی ان کے قدموں میں آ گرے۔ ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا۔ میرا نھا اب مگن تھا۔ جو کچھ آتا تھا اسی کے ہاتھ میں اور جس کا کام اٹکتا تھا وہ اسی کی خوشامد کرتا تھا کہ پیرانی جی دعا کریں تو کام ہو جائے گا۔

ہم کو یہاں رہتے ہوئے خاصے دو ڈھائی مہینے ہو گئے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ خوبن کے پاس دو ڈھائی روپیہ کے پیسے نقد نہ آجاتے ہوں۔ بڑا نھا تیسرے چوتھے روز روپیہ بندھوا لیتا تھا۔ خوبن کا تو کام چل رہا تھا۔ وہ کیوں گھبراتی مگر اب میرا دل اکھڑ گیا اور میں نے اس سے کہا کہ "اب گھر چلنا چاہیئے"، وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئی اس خبر سے لوگ اور بھی زیادہ اس کے گرویدہ ہوئے۔ غرض خدا خدا کر کے بڑی مشکل سے تین مہینے کے اقرار پر اجازت ملی۔ عورتیں اور مرد اس طرح رو رہے تھے جیسے کوئی اپنا عزیز جاتا ہے صبح کی نماز کے وقت ہم گاڑی میں بیٹھے اور شہر کی طرف روانہ ہوئے دوپہر کو ایک گاؤں میں جس کا نام "گرت"، تھا ہم لوگ ٹھہرے۔ کھانا بہت کافی تھا۔ اچھی طرح پیٹ بھر کر کھایا۔ کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیا اور درختوں کی چھاؤں میں تھوڑی دیر لیٹے۔ گاڑی بان نے بیلوں کے آگے کُٹی ڈالی۔ پانی پلایا۔ وہ بھی سستا لئے تو کوئی تین بجے کے قریب ہم آگے بڑھے مگر ایک بات سے میں کھٹک رہی تھی کہ گوجر گاڑی بان رستے بھر اکڑا اکڑا کر اور اکھڑ اکھڑ کر باتیں کر رہا تھا نھے نے کہا بھی کہ ذرا آہستہ بول۔ پیرانی جی سو گئی ہیں، تو اس نے جواب دیا "ایسی ایسی پیرانیاں بہت سی دیکھی ہیں"، ہم سمجھ رہے تھے کہ پانچ چھ روز میں شہر پہونچ جائیں گے اور چلتے وقت بھی یہ ہی سب نے کہا تھا کہ بیل موٹے اور جوان ہیں۔ یہ بچھڑے دوہری منزل طے کریں گے۔ دلّی چھٹے روز داخل ہو گی۔ مگر اب اس کمبخت نے کہا کہ "پورے پندرہ روز لگیں گے۔

ڈلی یہاں رکھی ہے۔ اسّی کوس جگہ کیا منہ کا نوالہ ہے،، میں نے دیکھا کہ اس
تیور بگڑ رہے ہیں اور وہ رستہ میں دغا دے تو اچنبا نہیں اس لئے رات
ہم نے خیر جون توں ایک گاؤں میں گذارلی۔ خوبن اور بچے پڑے سوتے
اور میں رات بھر جاگتی رہی۔ گوجر کمبخت بھی رات بھر جاگتا ہی رہا اور ج
وہ اٹھا۔ میں کھنکاری آخر اس نے کہہ ہی دیا "تجھے نیند نہیں آتی،، صبح
ہی میں نے خوبن سے کہا "الٹی لوٹ چل یا تو ایک آدھ آدمی ساتھ لے
گاڑی والا بدل،، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا اور ہم سب شہر کی طرف چلے۔
کوکنوئیں کے پاس دم لیا اور دو گھنٹے سستا کے آگے بڑھے۔ رات
"مینا پورے" میں ہوئی یہ میؤں کا گاؤں تھا۔ میرا ماتھا نام سنتے ہی ٹھنکا
خوبن کا دل شیر تھا وہ نہ ڈری اور ہم سب چوپال کے پاس اترے۔ گوجر
چھوڑ غائب ہوگیا اور دس بجے رات کے آیا۔ تو بی خوبن اور دونوں بچے
پی کر سوگئے تھے گوجر نے مجھ سے کہا "تیری نیند کون لے گیا۔ کل بھی تو رات
بھر جاگی اور آج بھی نہیں مرتی۔ ہمارے ہاں سے بہت کچھ کما کر لائی۔
وہ سب اُگلنا پڑے گا،، میں نے جلدی سے خوبن کو جگایا اور اب جو د
ہوں تو چار آدمی موٹے موٹے لٹھ لئے سر پر کھڑے ہیں ان میں سے ایک
کہا "اگر آواز نکالی تو ابھی مغز پھاڑ ڈالیں گے جو کچھ پاس ہو سب رکھ دو"
جی ذرا کھیلی تھیں اور اتنا ہی کہنے پائی تھیں کہ ہم "فقیروں کے پاس کیا
رکھا ہے،، کہ ایک شخص نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ دیا اور کہا "ار
بول،، اس کے بعد تلاشی ہوئی جو کچھ پاس تھا سب چھین لیا۔ یہ خدا کا
ہے کہ موسم گرما تھا ورنہ اور مصیبت آتی اس میلے کچیلے جوڑے
جو بدن پر تھا دانت کرید نے کو تنکا تک نہ رہا۔ ہمارے ساتھ آٹا اور گھی

تھا اور ہم سمجھتے تھے گھر پہونچکر بھی کھائیں گے مگر وہ بھی چھین لیا اور اس کے بعد انھوں نے دیا سلائیاں جلا کر میری اور خوبن کی صورتیں دیکھیں ہماری بھی تقسیم ہوئی اور اسی طرح دونوں بچوں کی بھی باری آئی وہ بھی بٹ ہیں نے کہا کہ چھوٹا بچہ میرے ساتھ رہے تو اچھا ہے نہیں تو مر جائے گا لیکن کسی نے نہ مانا اور ہم جس جس کے حصے میں آئے تھے اس کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوئے "

میں نے ایک ایک کے آگے منت خوشامد کی۔ قدموں پر سر رکھا لیکن وہ ظالم کیا مانتے خدا کا شکر ہے کہ میں جس کے پلّے پڑی وہ بدمعاش نہ تھا اُس کی گھر والی نے مجھے لونڈیوں کی طرح رکھا۔ میری اصلی مصیبت کا آغاز اسی جگہ سے ہوتا ہے۔

میں صبح چار بجے سے اُٹھا دی جاتی تھی اور ڈھوروں کا گوبر جمع کرکے اوپلے تھاپتی تھی اس کے بعد اُن ڈنگروں کی سانی اور کٹی کرتی۔ جب دوپہر ہو جاتی تو ان کو لے کر جنگل نکل جاتی۔ چلتے وقت گھر والی دو موٹی موٹی روٹیاں مجھے دیدیتی۔ میں جنگل ہی میں مولیاں توڑ کر روٹی کھاتی شام کو چار بھینسیں اور تین گائیں لے کر آتی تو پھر اِن کے دھندوں میں لگ جاتی اگر کام سے ذرا غفلت کرتی تو میاں کہتا۔

"مارے لکڑیوں کے سر پھاڑ ڈالوں گا"

کوئی دن اور کوئی رات ایسی نہ جاتی تھی کہ میں اپنے بچوں کی یاد میں آنسو نہ بہاتی ہوں۔ میں نے ایک دفعہ دل کڑا کر کے اس میاں سے پوچھا تو اس نے کہا "تیرے دونوں بچے اچھے ہیں۔ بڑا تو ذرا دور ہے مگر چھوٹا پاس کے گاؤں میں ہے اب وہ بھی کام کاج خاصا کرتا ہے۔

میں پچھلی سوموار کو گیا تھا اگر تو کام اچھا کرے گی تو تجھ کو اس چھوٹے سے ملوادوں گا،، میں اس کے قدموں میں گر پڑی۔ کچھ اس کو مجھ پر رحم بھی آگیا اور کہنے لگا۔ اچھا آج دوپہر کو یہ جو سامنے جھنڈے ہے اس کے نیچے ،، پربت نگر،، میں آجا تو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ تیرا چھورا بھی وہیں ہے ،، میں نے اس کو ہزاروں دعائیں دیں اور دوپہر سے پہلے ہی پہو نچ گئی تو دیکھا کہ پربت میں وہ بھی ایک چھوٹا سا سرکنڈا لئے بھینس چرا رہا ہے میری جان میں جان آگئی۔ اس کو کلیجہ سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ آخر جیٹھے کے کہنے سے اس کو چھوڑ گاؤں آگئی۔

سات مہینے اسی طرح گذر گئے ایک دن کا ذکر ہے کہ میں ندی پر ڈھوروں کو پانی پلا رہی تھی دوسری طرف میں نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ وہ بھی پانی پلا رہا ہے۔ مجھے اپنے بڑے لڑکے کا شبہ ہوا۔ آوازیں دیں مگر اس تک نہ پہونچیں تو جانور چھوڑ آگے بڑھی۔ پاس پہونچی تو وہ میرا بڑا بچہ ہی تھا آواز سنتے ہی تڑپ اُٹھا دوڑ کر آیا اور کلیجہ سے چمٹ گیا۔ ہم دونوں اسی طرح چمٹے ہوئے رو رہے تھے کہ ایک شخص چیختا ہوا آیا اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر انگ گھسیٹ لیا۔

بچہ کا چھٹنا میرے واسطے قیامت تھی۔ میں نے گھر پہونچکر اپنے چودھری کو سارا واقعہ حرف بہ حرف سنا دیا۔ وہ بعض دفعہ جب میرے کام سے خوش ہوتا تھا تو رحم سے کام لیتا تھا اور تعریف بھی کرتا تھا۔ اس وقت تو خاموش ہو رہا مگر دو تین روز کے بعد خود ہی کہنے لگا،، اچھا میں تیرے لڑکے کو ملوا دوں گا،، میں اس روز سے بلاناغہ دوپہر کے وقت اسی جنگل اور تالاب پر جاتی مگر پھر مجھ کو نہ بچہ ملا نہ وہ ڈھور ملے۔ ایک دن کا ذکر ہے۔

جھٹ پٹا وقت تھا کہ چودھری میرے بڑے کو ساتھ لیکر آیا اور کہا۔ "دیکھ میں نے اس سے کہہ دیا ہے اگر یہ رہنا چاہے، تو یہاں شوق سے رہ۔ کسی کی پرواہ نہ کر جلنوفی والے دنگا مچائیں گے تو میں اُن سے سُلٹ لوں گا میں یہ سنتے ہی باغ باغ ہوگئی دونوں میاں بیوی کا شکریہ ادا کیا اور جیبنے سے کہا "جہاں آپ نے اتنا احسان کیا ہے اتنا اور کیجیے کہ چھوٹے کو بھی بلوا دیجئے۔ ہم تینوں ان ڈھوروں کی خدمت پیٹ بھر کر کریں گے"۔ جیبنا یہ سنکر بہت خوش ہوا اور اپنے لڑکے سے کہا "جا پربت نگر سے اسکے چھوٹے کو لے آ"۔

میں کس زبان سے خدا کا شکرادا کروں، رات کو وہ لڑکا بھی آ گیا۔ میں نے اس سے چپکے سے پوچھا "ارے خوبن کی بھی کچھ خبر ہے" تو وہ کہنے لگا۔ "ہاں وہ تو ہمارے ہی گاؤں میں ہے" میں اس سے باتیں کر رہی تھی کہ پربت نگر کا نمبردار آن پہونچا اور بگڑ کر کہنے لگا "چھورے کا آچار ڈالا ہے" ہمارے چودھری نے کہا "ارے دیا کر دونوں چھوکرے آئے ہیں کال چلے جائیں گے" بات بڑھ گئی اور اس نے کہا "میں ابھی لے کر جاؤں گا" ہمارے چودھری کو بھی ضد آگئی اور اس نے قسم کھالی کہ "کل بھیجوں گا" لیکن بارہ بجے رات کے پربت نگر والے گئے اور یہ کہہ گئے کہ صبح خون خراب ہونگے۔ ہمارے چودھری نے کہا کہ "تو دونوں بچوں کو لے راتوں رات بھاگ جا صبح جو کچھ ہوگا میں دیکھ لونگا" میری تو جان میں جان آگئی مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ خوبن مریں میں نے اسی وقت چھوٹے کو لپکایا کہ جا کر خوبن کو چپکے سے لا" بڑی جان جوکھوں کا کام تھا اور میرا ہی دل گردہ تھا کہ میں نے جلتی آگ میں بچہ کو ڈال دیا۔ مگر خدا ساتھ تھا کام بن گیا اور بی خوبن آگئیں اس وقت ہمارے چودھری نے تھوڑا سا آٹا اور پیاز کی گٹھیاں ساتھ کیں اور کہا "جاؤ بھاگ جاؤ"

ایک یا دو بجے ہونگے ہم چاروں وہاں سے نکلے۔ خدا کی قدرت کے قربان جایئے۔ رات چاندنی تھی۔ صبح ہوتے ہی ہم کسی گاؤں میں پہونچے اور لوگوں کی آنکھ بچا کر ایک باغ میں گھس گئے۔ خوبن نے کہا اس باغ میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ یہاں لوگ آئیں گے الگ چلی چلو۔ ہم نے کنواں تو بھانپ لیا۔ اور آگے بڑھ کر ایک بڑ کے نیچے ڈیرا جمایا۔ آٹا گوندھا اور دیا سلائی سے آگ سلگا کر موٹے موٹے روٹ ڈالے۔ دوپہر سے پہلے ہی پہلے روٹیاں تیار ہوگئیں اور کھانے بیٹھے۔

اب ایک مزے کی بات سنو ایک جگادری بندر خدا معلوم کب سے بیٹھا تاک لگا رہا تھا۔ میری آنکھ اُدھر ہوتے ہی روٹیوں کی تھئی کی تھئی لے چلا۔ میں اور خوبن بڑا اور چھوٹا بہنیں اچھلے اور چلّائے مگر وہ کمبخت کیا چھوڑنے والا تھا درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے سوچا کہ چٹیل میدان میں صرف یہ ایک درخت ہے باقی آس پاس کوئی درخت نہیں۔ کب تک نہ اُترے گا اور کتنی کھائے گا ہم چاروں نے اس کے پتھر مارنے شروع کئے مگر وہ بھی ایسا چِچڑ ہو کر بیٹھا اور روٹیاں چھاتی سے لگائیں کہ پتھر پر پتھر پڑ رہے تھے۔ لیکن روٹی نہ چھوڑتا تھا۔ خوبن کا ایک پتّھر کھوپڑی پر ایسا لگا کہ بھنّا گیا اور سر سہلانے لگا۔ روٹیاں نیچے گریں تو ہم نے اٹھالیں اور کھانے بیٹھے۔ دن اسی طرح ہم نے گذارا۔ شام کو تھوڑی سی روٹیاں اور پکالیں اور آگے بڑھے۔

سڑک پر پہونچے تو پربت نگر کی ایک بڑھیا کُبڑی چلی جارہی تھی ہم کو دیکھ کر بہت پھیلی اور کہنے لگی ”ابھی گاؤں کے لوگوں کو بُلا کر تم کو پکڑواتی ہوں۔ مبتنوں کی چوری کی اور یہاں بھاگ کر آئے،، میں نے جتنی اس کی خوشامد کی نامراد اتنی ہی سر پر چڑھی اور لگی غل مچانے۔ آخر خوبن نے سر کے بال

پکڑ کر کہا "آواز نکالی تو جان سے مار ڈالوں گی" یہ کہکر دونوں ہاتھ خوبن نے پکڑے اور ایک پاؤں بڑے نے اور ایک چھوٹے نے۔ ڈنڈا ڈولی بنا کر خوبن اُس کو ایک جنگل میں لے چلیں۔ مجھے تو خبر بھی نہ تھی چار پانچ گز گہری ایک کھو یہاں بی خوبن نے دیکھ لی تھی۔ وہاں پہونچکر لگی بڑھیا ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے کہ "رحم کرو اور چھوڑ دو" میں تو شاید چھوڑ دیتی مگر لڑکے راضی ہوئے نہ خوبن اور تینوں نے مل کر اس مردود کو پھینک دیا خدا بہتر جانتا ہے کہ چوٹ کہاں لگی مگر خوبن نے کہدیا تھا کہ "اگر رات تک آواز نکالی تو مارے پتھروں کے بُھرکس کر دوں گی"

اب ہم بھاگم بھاگ چلے اور دم بھر کو کہیں نہ ٹھٹکے، صبح ہم کو شاید "پانی پت" میں ہوئی۔ یہاں پہونچکر ہماری جان میں جان آگئی اور ہم نے جنگل ہی میں بسیرا لیا۔

ہم کو یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ اب خدا کے فضل سے شہر میں امی جمی ہے اور یہاں کے نواب نے ایک محلسرا میں دلّی کے بھاگے ہوئے آدمیوں کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ وہ دو دو دن رہ کر جہاں جانا ہو چلے جائیں۔ ہم چار بندے بھی اس محلسرا میں دو دن رہے۔ کھانے کا انتظام خاصا تھا لنگر کی روٹی جیسی ہوتی ہے ویسی تھی۔ خیر خدا کا شکر ادا کیا اور پیٹ بھرا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں پناہ کا مقدمہ ہو رہا ہے اور نمکحراموں نے زور شور سے حضور کے خلاف گواہیاں دی ہیں اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا کہ چار دِن کی زندگی کے واسطے کیسے کیسے کمبختوں نے اپنا منہ کالا کیا۔

مقدمہ کی خبر سنتے ہی ہوش جاتے رہے۔ پر نہ تھے کہ اڑ کر پہونچ جاتے دوسرے ہی دن ہم کو خبر لگ گئی کہ مقدمہ کا فیصلہ ہوگیا اور سرکار رنگون بھیجدیئے

گئے! اس خبر کے سُنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور میں نے پکّا ارادہ کر لیا کہ اب شہر نہ جاؤں گی مگر پردیس میں بھیک کب تک مانگتے اور کیا کرتے۔

"پانی پت" سے چل کر "ہم بہر و پور" میں آئے۔ ایک دن ایک رات یہاں ٹھہر کر آگے بڑھے۔ تو بی خوبن کو رستہ میں بخار چڑھ آیا اُن کے لینے کے دینے پڑ گئے۔ کہیں تیسرے دن ان کا بخار اُترا تو گھر کا رخ کیا۔ یہاں پہونچکر شہر کی جو کیفیت دیکھی کلیجہ پر گھونسے لگ رہے تھے جدھر نظر جاتی تھی سنسان! اور جس چیز کو دیکھتی تھی اُجڑی ہوئی! حضور روانہ ہو چکے تھے! اس خیال نے تمام اُمیدوں کا خاتمہ کر دیا اور دل زندگی سے سیر ہو گیا مگر جو کچھ گذری خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح گذری!"

یہاں تک بیان کرنے کے بعد شہزادی قمرارا بیگم کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اِن کے آنسوؤں نے شمع جھلملا دی۔ اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو آسمان کروٹ لے رہا تھا اور تارے دامن شب سے جُدا ہو رہے تھے

بیگم نے اپنے پھولوں کی لپٹ سے مجلس کو مست کیا اور کہا "بیبیوں شمع جھلملا گئی اور پھول ٹھرا گئے۔ رات ختم ہوئی۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

شہزادیوں کا نالہ ختم ہو چکا، اور وہ رات جس نے مدتوں کے بچھڑے ملوائے کبھی کی رخصت ہوئی۔ یہ متبرک صورتیں جنھوں نے جہاں آباد اور اس کے حکمراں پر فاتحہ کے پھول چڑھائے میرے سامنے ایک ایک کر کے اٹھی ہیں، شاداب پھولوں کا یہ گلدستہ، جس کی خوشبو نے دماغ معطر کئے! دِلّی، اور بہادر شاہ کو یہ رونے والے جن کی آنکھوں نے بیتلے میں موتی برسائے، میرے

روبرو فنا ہوئے! جیلے کے پڑھنے والے، اس مضمون کو کہانی سمجھیں، یا قصّہ، مگر میرے دل سے پوچھو، کلیجہ کے ٹکڑے اُڑتے ہیں جب وہ سماں یاد آتا ہے، جس وقت عالم خیال وہ صورتیں سامنے لاتا ہے، اور حافظہ مٹنے والی مورتیں سامنے لاکھڑی کرتا ہے تو دِل وحشی ٹکریں مارتا ہے، وہ رات جس کے ہر لمحہ میں، صداقت، و انسانیت کے خزانے دفن تھے، اپنے ساتھ بہت کچھ نہیں سب کچھ لے گئی! جہاں آباد اپنی رونق اور چہل پہل وداع کر چکا! جن گھروں سے محبّت و ایثار کے چشمے پھوٹے، جن دہلیزوں نے حقّانیت کے ڈنکے بجائے آج سنسان و خاموش ہیں، اور جن محلوں کی سرزمین سے، درسِ وفا کی آندھیاں اُٹھی ہیں، وہاں اس وقت خاک اُڑ رہی ہے!!!

شہر کی بہت سی عمارتوں کے آثار کھنڈر بنے ہوئے ابھی تک نقشِ پا کا پتہ دے رہے ہیں پھول والی بیگم کی صدا "لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی" جو جہاں آباد کی فضا میں گونجی ہے اور جو اِس رات کی شمع اور اس بزم کی عروس تھی مدتیں ہوئیں فنا ہو چکی۔ مگر اس کی لہک ابھی تک میرے کانوں میں بس رہی ہے اور جب کبھی "فراشخانہ" کے سامنے سے گذرتا ہوں تو آنکھیں اس ٹیلے کو ڈھونڈھتی ہیں جہاں سے یہ صدا بلند ہوتی تھی اور چمبیلی کے پھول خاندان تیموریہ کی بدبخت بیگمات کے انقلاب کی داستان سناتے تھے

جس وقت زمین اور آسمان خاموش آنسوؤں میں رات کو وداع کر رہے تھے اس وقت کا درد انگیز منظر انسانی نظر بہت کم دیکھے گی شمع کی روشنی اور تاروں کا اجالا دونوں پھیکے پڑے، دنیا اپنے چہرہ سے رات کا بُرقع

سرکار ہی تھی آسمان کی سیاہی آہستہ آہستہ سپیدۂ صبح میں جذب ہوئی اور
نیموری بیگمات کا دستہ بادِ سحر کے جھونکوں سے کھلنے کی بجائے منتشر ہوا جب
صحبتِ شب کی یادگار، مرے ہوئے پان، مرجھائے ہوئے پھول، بکھری
ہوئی چھالیہ اور فرش کی سلوٹیں باقی رہ گئیں تو ایک متفقہ صدا بلند ہوئی اور
بادشاہ کی مغفرت کی دُعا ہوئی۔ اس وقت تماشائیوں نے جن میں عورتیں
مرد دونوں شامل تھے گوھر آرا بیگم سے درخواست کی کہ زیادہ انتظار ہمارے
واسطے پہاڑ ہوگا۔ حضور کی جدائی نے ہمارے دلوں میں زخم ڈال دیئے ہیں
رات نے ہمارے زخموں کا مداوا کیا اور آپ نے ہمارے چکنا چور دلوں پر مرہم
لگے پھائے رکھے۔ کل بسنت تھی آج میلہ ہوا اور رات کو اسی میدان میں
باقی داستان ختم کیجئے۔ "کوٹلہ" کے جانے میں زحمت ہوگی اور دل کے ارمان
دل میں رہ جائیں گے۔ شام بگڑنی مشکل ہے۔ رحم کیجئے اور ایک دن ہو
دو دن لگاتار رکھئے۔

اس درخواست پر سخت اصرار ہوا اور جب یہ طے ہوگیا کہ میلہ تین
اور رہے گا تو لوگ خوشی کے مارے اُچھل پڑے اور دوکانداروں نے اپنی
دوکانوں کا اور سیلانیوں نے اپنے ڈیروں کا راستہ لیا۔

(۴) شہزادی قیصر جہاں بیگم کی آپ بیتی

اُجڑا ہوا بیلہ جہاں ہر طرف جھاڑ جھنکار تھے بیوہ کی طرح ایک
پھر دلہن بنا جبین عروس پر دن ڈھلتے ہی افشاں چُنی جانے لگی۔ آج
بسنت کا وہی زور تھا اور قدرت بھی شہر والوں کے مجروح جذبات کی ہمنوا
کر رہی تھی خود رو پھولوں کی زردی نے میلہ کی شان دوبالا کردی اور غروب

آفتاب کے ساتھ ہی شمع نے اپنے آنسوؤں میں دلّی والوں کو آج پھر دورِ گذشتہ کی تصویر دکھا دی۔

"گوھری نمبو" کل سے زیادہ آراستہ تھا اور خلقت اس طرح ٹوٹ رہی تھی کہ بیٹھنے کو جگہ تھی نہ کھڑے ہونے کو۔ مجبور مچان بنایا گیا اور تخت پر گوھر آرا بیگم غدر کی ماری شہزادیوں کو ساتھ لے کر بیٹھیں۔

جلسہ عشاء کے بعد شروع ہو گیا سب سے پہلے "پھول والی بیگم" نے اپنے چھپے کھولے۔ موتیا کی بھینی بھینی خوشبو نے دماغ معطّر کر دیئے اور نمبو میں یہ صدا گونجی

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

پیسہ پیسہ دو دو پیسے کے پھول بکنے شروع ہوئے ادھر گاہکوں کی آواز تھی کہ "ایک پیسہ کے اور" "دو پیسہ کے اور" اُدھر بیگم لہک رہی تھی

"کٹورا سے پھول موتیا کے"

"موتیا ہے گجراتی"

چوٹی دار دو چھپے آدھ گھنٹہ میں ختم ہو گئے تو گوہر آرا بیگم نے کہا

"بس بوا بیگم اب ایک چھپا رہنے دو دیر ہو رہی ہے"

شمع گھومنی شروع ہوئی۔ کچھ پڑھنے پڑھانے کو نہیں بلکہ مفرور کی صورت دکھانے کو۔

سب سے پہلے گوھر آرا بیگم نے اپنے ہاتھ سے شمع قیصر جہاں بیگم کے سامنے رکھی اور کہا "وہاں بیگم اپنی بپتا سنایئے لوگ مشتاق ہیں"

قیصر جہاں بیگم نے پان کھایا اور مجمع کی طرف دیکھ کر کہا۔

دلّی والوں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرو۔

"الٰہی جہاں پناہ کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب ہو"

دُعا ہو چکی تو قیصر جہاں بیگم نے کہا۔
نیاز علی مخبر جس کا دَور دورہ تھا اور سچ پوچھو تو موت کی کل جس کے ہاتھ میں تھی میرے شوہر مرزا اسکندر کی پھانسی کا حکم مجھ کو دوپہر ہی کو سُنا چکا تھا اس نامراد کافر نے جو ستم توڑے ہیں فرعون اور نمرود نے بھی نہ توڑے ہونگے! اس نابکار نے سینکڑوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ میرے شوہر سے اُس کو سدا کی لاگ ڈانٹ تھی۔ اسی نے جھوٹی مخبری کی اور بیمار کو پکڑوا دیا۔ اس اندھیر کو دیکھو کہ گٹھیا کا بیمار جو چلنا پھرنا تو درکنار کھڑا تک نہیں ہو سکتا۔ کیا لڑے گا اور کیا مارے گا۔ مگر اندھیر نگری اور چوپٹ راج تھا۔ شاباش ہے ان عقلوں پر جنھوں نے یقین کیا اور پھانسی کا حکم دیدیا۔ مرزا بیچارے نے لاکھوں قسمیں کھائیں اور بہتیرا ہی کہا "میری تو دونوں ٹانگیں رہی ہوئی ہیں" مگر کسی نے نہ سُنی۔ نیاز و کمبخت کی خدائی تھی جس کو چاہا پسوا دیا۔ کھٹمل کی طرح دم بھر میں مَسل دیا، اس مُردے کی صورت دیکھتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے تھے کہ دیکھیے جوانا مرگ کس کی سناؤنی لاتا ہے کہ اس نے چُگّی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "مرزا جی جا رہے ہیں ملنا ہے تو مل لو اور چار پانچ گھنٹے کے مہمان ہیں" اماں جان اندر بیٹھی ختم پڑھ رہی تھیں سنتے ہی دہم ہو گئیں۔ اور باہر نکل کر کہا۔
"الٰہی مر دے نیازو تجھے ڈھائی گھڑی کی۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے تو سمجھے غریبوں کا صبر خالی جائے یہ ہونا نہیں۔ خدا اور اس کا رسول چاہے تو تن بدن میں کوڑھ ٹپکے گی اور رجھ رجھ کر مرے گا"
وہ ناشاد تو چلتا کھڑا تھا۔ سینکڑوں گھر اُجڑوا لئے۔ مرزا بیچارے کس گنتی میں تھے یہ کہہ سیدھا ہو لیا کہ "کوؤں کے کوسنے سے ڈھور نہیں مرتے" اور ہماری آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ ان دنوں پھانسیاں دو جگہ ہوتی تھیں۔ کوتوالی

چبوترے پر اور جمنا کی ریتی میں۔ ہم دونوں ساس بہوئیں پہلے کوتوالی گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ شام کو پانچ بجے دریا پر باڑ ماری جائے گی۔ یہاں سے اُدھر گئے تو سینکڑوں بدنصیبیں کھڑی اور بیٹھی کلیجوں پر گھونسے مار رہی تھیں۔ ٹکریں مار مار کر شام پکڑی عصر کے بعد بے قصوروں کا ٹانڈا آیا۔ مرزا کو دیکھ کر اماں جان نے ایک چیخ ماری اور چاروں طرف کہرام مچ گیا۔ ایک فرنگی نے آکر سب کو قطار میں کھڑا کیا۔ اور سپاہیوں نے بندوقیں چھوڑ دیں۔ بیچارے اللہ مارے تڑپ تڑپ کر چلتے ہوئے اور جہاں پناہ کا فرمانا صحیح ہو گیا۔

"نہ کفن ملا نہ وہ دفن ہوئے۔ نہ ہے فاتحہ نہ مزار ہے"

اماں جان مرزا کے گرتے ہی لپکیں۔ وہ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ گولی کنپٹی میں لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے سر اُٹھا کر گود میں لیا اور پیار کرنے لگیں کہ اسی مُردے نیبازو نے لاش چھین لی اور دھکا دے کر کہا "دو بڑھیا آگے بڑھ" لاشیں بھنگیوں اور چماروں نے اُٹھا کر دریا میں پھینک دیں اور ہم سب جدھر جس کا مُنہ اُٹھا روتے پیٹتے چلے گئے!

اماں جان بارہ مہینے کی بیمار تھیں اور جب سے بڑے مرزا کو گٹھیا ہوئی تھی دن دن بھر اور رات رات بھر وہاں روتی تھیں۔

عمر بھر کی کمائی یہ ہی ایک دم تھا سنبھل نہ سکیں۔ میں اِن کو لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھی کہ اُن کو زور کی کھانسی اُٹھی اور کھانسی کے ساتھ ہی۔ انس اُکھڑ گیا اور اُنھوں نے پانی مانگا۔ وہاں پانی کہاں، میں دریا کی طرف دوڑی، چلّو میں پانی لائی مگر وہ میرے پہونچنے سے پہلے ہی اللہ کی پیاری ہو چکی تھیں میرا کلیجہ مُنہ کو آرہا تھا اور اکیلی بیٹھی ان کی صورت دیکھ رہی تھی کہ نیبازو مُردے نے پیچھے سے آکر کہا۔

"ارے بڑھیا لڑک گئی۔"

اس کے ساتھ ایک سپاہی تھا دونوں نے مُردے کو لے جاکر دریا میں پھینک دیا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ نمکحرام نیاز و جو نانا جان کا غلام تھا طوطے کی طرح دیدے بدل اپنی ہستی بھول جائے گا۔ رو رہی تھی کہ وہ ہنستا ہوا آیا اور کہا۔

"اب تم مجھ سے نکاح کرلو۔"

میرے سر سے جو لگی تو تلووں سے نکل گئی بدن بیری کی طرح تھر تھر کانپنے لگا۔ آگے بڑھ کر میں نے اس کے پٹھے پکڑ لئے اور کہا۔

"موئے پاجی تیری یہ ہستی کہ اس مُنہ سے نکاح کا نام لے۔"

مگر کجا میں عورت اور کُجا وہ مرد!

جھٹکا دے ہنستا ہوا سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "اسی میں خیر ہے نہیں تو دو دو دانوں کی نرسو گی۔ ادب ودب کو پھونک دو اور آج ہی نکاح کرلو"۔ میرے بدن میں آگ لگ رہی تھی اور وہ ناشاد ہنسے جا رہا تھا۔ ایک کی ہزار سنائیں۔ مگر اللہ رے بے غیرتی۔ تو سو کی بندی کے ڈنڈ پڑ رہی تھی۔ جوانامرگ پر اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ کہنے لگا۔ اُس جنگل میں کوئی شیر بھیڑیا یا دیو کھا جائیگا۔ کب تک بیٹھو گی کیا کھاؤ گی اور کہاں سوؤ گی"؟

میں کیا بتاؤں کہ کیا گذری تھی جی چاہتا تھا موئے کو کچا کھا جاؤں۔ آگے بڑھ کر پھر پکڑا اور دو ہنٹر پورے زور سے مارا۔ مگر اس ناشاد پر کیا اثر ہوتا۔ میں اس کو کوس رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے آکر کولی بھرلی۔ ہاتھ اس نے پکڑے اور پاؤں کمبخت نیاز و نے اور مجھ کو ڈنڈا ڈولی کرلے چلے۔ خدا ہی جانتا ہے آدھی تھی یا پچھلا یہ دونوں ملعون مجھ کو ایک ٹوٹے ہوئے بُرج

ہیں لئے اور نیاز و نے چاقو نکال کر کہا "اگر آواز نکالی تو جان سے مار ڈالوں گا۔"
اب اور مصیبت یہ آئی کہ بیاہ ہی ہوا تو قاضی بنا اور نیاز و مُردا دولھا۔ قاضی جی ہندو تھے جن کو ایک حرف خطبہ نہ آتا تھا انھوں نے نکاح پڑھایا مجھ پر جو بپتا پڑی خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ جی چاہتا تھا کہ نابکاروں کو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی نمک نصیب نہ ہو۔ مگر اب تو میں خود ہی مر رہی تھی۔ مجھے اس وقت وہ سماں یاد آرہا تھا۔ جب بڑے ننھے کے پیدا ہونے پر جہاں پناہ نے خود عقیقہ کیا تھا چھٹی کے روز بجز دم تام جھام رکھا اور میں ہوائی محل میں جہاں پناہ کے ہاں پہونچ گئی۔ دن بھر کی چہل پہل مردوں اور عورتوں کا غل غپاڑہ، کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی شام کو حضور نے آکر فرمایا۔

"زچہ کو تارے دکھاؤ"

میرے اور ننھے کے ماتھے پر کارچوبی پٹیاں۔ جو اماں جان نے بھیجی تھی باندھی گئیں۔ یہ پٹیاں میری بڑی نند نے خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے باندھی تھیں۔ ان کو سات اشرفیاں نیگ کی ملیں دولہا میاں کو بلا کر چھپر کھٹ میں بٹھایا۔ اور تیر کمان ان کے ہاتھ میں دی کہ لو میاں مرگ مارو۔ مرزا صاحب نے ایک خالی تیر چھپر کھٹ کی چھتری پر چھوڑ دیا اور میں سب کے کہنے سے تین لاتیں چھپر کھٹ کو مار کھڑی ہوئی اور باہر آکر آسمان کو دیکھا۔ دائی نے اس وقت آٹے کی چار چومکیں بنائیں۔ ایک بڑی سی تھالی پر گندھا ہوا آٹا رکھکر اس میں چار جگہ موم بتی رکھی اور بچہ کو میری گود میں دیا۔ دو عورتوں نے شمع لی ایک نے قرآن مجید کا سایہ کیا اور دو نے تلواروں کا کہ بچہ جن بھوت ہر بلا سے محفوظ رہے۔ میں تارے دیکھ رہی تھی بیویاں لال

اڑا رہی تھیں میرا سینہ لپک لپک کر گا رہی تھیں۔

اتفاق سے اُس روز ایک انگریز قلعہ میں آیا تھا وہ بھی جہاں پناہ کا مہمان ہوا اور سرکار کی اجازت سے اُس نے اس وقت کی تصویر اُتاری ایک تصویر سرکار نے مجھ کو بھی دی تھی اور وہ اب تک میرے پاس موجود ہے۔

میری نظروں میں اُس وقت وہ سماں پھر رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ دونوں بدمعاشوں کو زمین میں زندہ گاڑ دوں۔ خیر یہ بات سمجھ میں آئی کہ نرمی اور دھوکے سے کام لوں۔ تقدیر سے سپاہی بھاگوان ایسا بے خبر سوا کہ خرّاٹوں کی آواز بُرج سے باہر جانے لگی۔ میں نے نیاز و سے کہا کہ ”جو ہونا تھا وہ ہوگیا اب خدا انجام بخیر کرے۔ پیاس کے مارے مر رہی ہوں دو گھونٹ پانی تو لاؤ“

اتنا سُنتے ہی اس ناشدنی کی تو جان میں جان آگئی وہ پانی کو گیا اور میں بُرج سے باہر نکل ایک طرف کو ہولی۔ مجھے خبر نہیں کہ کہاں ہوں اور کدھر جا رہی ہوں۔ صبح ہوئی تو ایک ٹیلیا کے اندر گھسی اور دن وہیں ٹیر کیا۔ کربلا کا مزا آگیا۔ دانہ نہ پانی دن بھی قیامت کا تھا کہ ختم ہی نہ ہوا خدا خدا کرکے شام ہوئی تو پھر جنگل کا رستہ لیا اور رات بھر بھاگتی رہی۔ صبح ہوتے ”دکنی پورے“ میں پہنچی۔ اب مجھ میں بات کرنے کی ہمّت نہ تھی۔ خدا کی قدرت کے قربان جائیے ایک بڈھا مسلمان روٹیاں اور گُڑ بانٹ رہا تھا۔ اس نے مجھ کو دو روٹیاں اور گُڑ کی ڈلی دی مجھے تو وہ امرت تھی۔ ہاتھوں ہاتھ لی اور ایسی گری کہ دم بھر میں دونوں روٹیاں چٹ کیں۔ اس کا بچّہ بیمار تھا مجھ کو بھوکا دیکھکر دوا اور دیں۔ وہ کھا کر خدا کا شکر کیا اور اس سے کہا ”بابا تھوڑا سا پانی بھی پلوا دو“ وہ اپنے ساتھ لے گیا اور پانی پلوا کر کہا۔

”یہ بچّہ بیمار ہے اس کے واسطے دُعا کر“

اے مولا نثار جاؤں۔ مجھ ناچیز بندی کی دُعا کیا۔ مگر اس نے ایسی سنی کہ بچّہ

رات ہی کو اُٹھ بیٹھا۔ اب تو میری وہ آؤ بھگت ہوئی کہ کیا کہوں سارا گھر پوجنے لگا۔ جانے کا نام لیتی جب ہی بڈھا اور اس کی بیوی روتے، بچے بھی مجھ سے ایسے ملے کہ دم بھر کو پیچھا نہ چھوڑتے۔ اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میرا بھی دل لگ گیا۔ جب حضور کے رنگون جانے کی خبر سُنی تو میری ہچکی بندھ گئی اور آنے کا ارادہ کیا تو بڈھے نے مجھے خود یہاں تک پہونچایا۔ یہاں آکر سُنا کہ اس نامراد نیازو کی کھٹیا کٹ رہی ہے اور پیٹھ میں اَدِٹ نکلا ہے۔ میں بھی اس کے ہاں گئی نا ہنجار کی ایک ایک چیخ آسمان تھی اور ایک زمین شاید دس گیارہ روز اسی طرح تڑپ تڑپ کر مرگیا۔

وہ وقت گذر گیا اور یہ وہ وقت بھی گذر جائے گا۔ مگر اب بھی جب کبھی اس بُرج والی نکاح کا خیال آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ نیازو مردے کی بوٹیاں چبالوں "

قیصر جہاں بیگم کی داستان ختم ہوئی تو آدھی رات ختم ہو چکی تھی نیازو مخبر پر چاروں طرف سے لعنت کے نعرے پڑنے لگے آخر گوہر آرا بیگم نے کہا "بیویو وہ مرگیا اب اس کو بُرا کہنے سے کیا فائدہ۔ اس نے جیسی کی، بھگت رہا ہوگا"

جب مجمع خاموش ہوگیا تو پھر وہی صدا گونجی۔

"لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

بیگم کی سُریلی آواز نے دلوں کی کلفت زائل کردی۔ اِدھر پھولوں کی مہک اُدھر نیموربہ بلبل کا نغمہ، آدھی رات کا وقت، سناٹے کے عالم میں دلوں کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ صاحبِ بزم یعنی گوہر آرا بیگم نے اپنی چچازاد بہن برجیس دولھن کے سامنے شمع رکھی اور کہا۔

"بیگم اب مجلس آپ کی داستان سننے کی مشتاق ہے آپ جہاں پناہ کو سب سے زیادہ عزیز تھیں اور حضور اپنی آنکھ سے دم بھر کو اوجھل نہ فرماتے تھے۔ آپ اپنی بپتا سُنائیے"

(۵) شہزادی برجیس دولہن کی سرگذشت

برجیس دولہن نے ادھر اُدھر دیکھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا

"بیویوں حضور ہم سے جُدا ہوگئے اور سات سمندر پار دنیا سے رخصت ہوئے ہم کو ان کا آخری دیدار نصیب نہ ہوا۔ زندگی کے جو تھوڑے دن باقی ہیں وہ اسی حسرت میں کٹ جائیں گے سب سے پہلے حضور کی مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھاؤ"

برجیس دولہن کی زبان سے اِدھر حضور کا نام نکلا اُدھر آنکھ سے آنسو نکلے اور ان کے ساتھ ہی مجمع پر رقّت طاری ہوگئی۔ عورتیں اور مرد سب اپنے بادشاہ کی یاد میں رو رہے تھے۔

جب دُعا ختم ہو چکی تو گوھرارا بیگم کے تقاضے پر برجیس دولہن نے کہا "جب گولیوں کی باڑ اور پھانسیوں کی قطار کا زور ہو رہا تھا تو گھر میں صرف ہم دو میاں بیوی ہی تھے اور کوئی اتنا نہ تھا کہ دوائی ٹھنڈائی تو درکنار دو گھونٹ پانی ہی کے لادے۔ پکڑ دھکڑ کا یہ عالم کہ جو باہر نکلا پھر نہ پلٹا۔ صبح کو گیا تو دوپہر کو نکلا تو شام کو پھانسی کی خبر آگئی۔ ہماری گلی میں کھاری پانی کا کنواں تھا رات کو میں چپکے سے جاتی اور دو لوٹے بھر لائی۔ خدا بھلا کرے بچارے احسن عطار کا اس نے مجھ کو خاکسیرا اور عناب کے شربت کی ایک بوتل دیدی تھی۔ دونوں وقت بیمار کو وہی پلا دیتی دوسرے تیسرے وقت خالہ گدری کچھ چنے دے دیتیں۔ وہی کھا کر پانی پی لیتی۔ مہینہ سوا مہینہ اسی طرح گیا مگر نتھے دولہا کا بخار نہ اُترا۔ صبح کو ہلکا ہوجاتا۔ مگر دوپہر سے پہلے اور چڑھتا۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئیں تھیں۔ مزاج ایسا چڑچڑا ہوگیا تھا کہ بات بات پر بگڑتے تھے۔ میرا محلہ دریا خانم کے بازار سے ملا ہوا تھا۔ اور ابھی تک اللہ کا فضل تھا۔ کہ حکیم باؤلے

کے داماد نے ایک دن نشہ میں کسی گورے کی ٹوپی اُچھالی اور اس کی میم کو پکڑ لیا
اب کیا تھا شام تک تو چاروں طرف گورے ہی گورے تھے ۔ گھروں میں گھس گھس
کر مردوں کو پکڑا اور مارا لیکن آدھی رات کو جا کر امّی جمّی ہوئی ۔ میں کنڈی لگائے
جا نماز پر اللہ اللہ کر رہی تھی اور ست ہی ست پر جان تھی ۔ پچھلا پہر ہو گا کہ خالہ
کبریٰ نے آواز دی ۔ میں نے دروازہ کھولا وہ اندر آئیں اور کہا ۔

”جس طرح ہو ۔ ابھی یہاں سے بھاگو صبح کو سارا محلہ توپ سے اُڑے گا“
میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور کہا ۔ ”بھلا خالہ میں کس طرح بھاگ سکتی ہوں ۔ تمہی دو لہا
کو کیوں کر لوں ۔ یہ نہ چل سکتے ہیں نہ اُٹھ سکتے ہیں ۔ اِن میں رکھا ہی کیا ہے ہڈیاں ہی
رہ گئیں ہیں“ وہ بولیں ”دیر کا موقعہ نہیں جس طرح ہو ، اُٹھاؤ سب پکڑ کر لے جائیں گے“
میں تو جانوں تین بجے ہوں گے کہ ہم سب ، بھرا گھر چھوڑ چھاڑ شہر سے نکلے ،
بیمار کو ڈنڈا ڈولی کیا اور ایک طرف کو چلے ۔ صبح ہم کو ”نظام الدین“ میں ہوئی مگر آگے
بڑھے گئے ۔ دن بھر کیا گذری رستہ کس طرح کٹا اللہ ہی بہتر جانتا ہے کھیل کا دانہ
بھی اُڑ کر منہ میں نہ گیا ۔ پیاس کے مارے جان نکلی جاتی تھی مگر پانی کا پتہ نہ تھا
کنوئیں تھے مگر رسّی تھی نہ ڈول ۔ شام کو خواجہ صاحب کے قریب ہم ایک گاؤں میں
پہونچے ۔ پنہاریاں ایک کنوئیں میں پانی بھر رہی تھیں ۔ وہاں ٹھہر کر پانی پیا اور
بیمار کو بھی پلایا ۔ چاند نکل آیا تھا اور ہم بڑ کے نیچے پڑے تھے کہ جاٹ آئے اور
دونوں مردوں کو پکڑ کر لے گئے ۔ میں اور خالہ کبریٰ رہ گئے ۔ سوچ رہے تھے کہ کیا
کریں ۔ اتنے میں دونوں مرد خالہ کے میاں اور لڑکا خوش خوش آئے ۔ نشکے کا
بھرا ہوا تھال شکر اور دہی بڑا ہوا اُن کے پاس تھا ۔ دیکھ کر جان میں جان آگئی اور
اس بُری طرح ڈر ڈر کر [illegible] کو بھی پار کیا ۔ رات ہم نے وہیں کاٹی ۔ صبح ہم پانچوں آگے بڑھے
دو پہر تک تو ہم راستہ پر چلے ۔ بیمار کی وجہ سے آگے نہ چلا گیا باری باری

کرکے تھوڑی تھوڑی دُور سب سے جا رہے تھے۔ دھوپ تیز ہو گئی تو ہمارے تھکنے سے پہلے ہی بیمار کی حالت ردّی ہو گئی آنکھیں بند ہو گئیں اور سانس نام کو رہ گیا۔ خالہ کبری بی نے دیکھ کر کہا "وارے خدا کے لئے ٹھیرو۔ ذرا ننھے دولہا کو تو دیکھو کیا ہو رہا ہے" میں آگے تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے کلیجہ میں گھونسا مارا، جان نکل گئی۔ ٹھٹکی تو کیا دیکھتی ہوں کہ منکا نک ڈھل گیا ہے! ایکر کے کمبخت درخت کے نیچے جہاں کانٹے ہی کانٹے پڑے تھے۔ ٹھیرے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے زمین صاف کی ان کو لٹایا۔ دوپٹوں سے پنکھے جھلے۔ تو خالہ نے کہا کہ "ہڑیاں بندھی ہوئی ہیں۔ دو گھونٹ پانی کے ہوں تو حلق تر ہو جائے۔ شاید آنکھ کھولیں" مگر وہاں پانی کہاں میں تو خدا کی قدرت کی اُس دن ایسی قائل ہوئی کہ عمر بھر یاد رکھوں گی۔ رو رو کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ سامنے سے دو گورے کندھوں پر بندوق رکھے آتے دکھائی دیئے۔ ہم سب کی روح فنا ہو گئی۔ اُن میں سے ایک آگے بڑھا۔ ہم نے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ درود پڑھنے لگے کہ اب یہ گولی مار دیں گے۔ وضو بھی نصیب نہ ہوا۔ چھپنے کی کہیں جگہ نہیں بچنے کا موقع نہیں۔ کھڑے کانپ رہے تھے کہ گورے سر پر آ پہونچے پوچھا، ہرن ہرن ہرن آیا ہرن آیا۔ خالہ کبری نے ہمّت کی اور کہا "نہیں صاحب ہم نے نہیں دیکھا"، یہ سُنکر انھوں نے بیمار کو دیکھا اور پانی کی چھاگل دے کر کہا "پانی۔ پانی" پانی ......" ہم لرزتے رہے اور دونوں گورے پانی دے چلتے ہوئے۔ ہم نے جس طرح ہوا چُلّو میں پانی لے کر بیمار کے حلق میں ٹپکایا۔ اور اس نے ذرا آنکھ کھولی تو جان میں جان آ گئی۔ خدا اپنی قدرت کے کیا تماشے دکھاتا ہے۔ ملک الموت کو رحمت کا فرشتہ بنا دیا۔ بھوک کے مارے ہم بلبلا رہے تھے کہ ہمارے سامنے ایک زخمی ہرن لنگڑاتا ہوا آیا اور گر پڑا۔ خالہ نے اسے پکڑ لیا تو سامنے سے ایک گڈریا بکریاں چراتا آیا اور کہنے لگا "یہ زخمی ہے

مر جائے گا۔ لاؤ ذبح کردوں" ہم نے پوچھا "تو مسلمان ہے" اس نے کلمہ پڑھا
ہم نے کہا بسم اللہ۔ اُس نے چاقو نکال کر ذبح کیا۔ ہم کو خبر تھی نہیں سامنے ہی
گاؤں تھا۔ بھاگا ہوا گیا اور سب چیزیں لے آیا۔ اسی نے کھال اُتاری۔ اسی نے
آگ جلائی۔ اسی نے ہنڈیا دی۔ وہ ہمارا مہمان ہوا اور ہم اس کے مہمان ہوئے
سب نے مل کر خوب کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ گڈریئے کا یہ لڑکا اٹھارہ بیس
برس کا ہوگا۔ گاؤں کا رہنے والا جس کو شہر کی آب وہوا چھو تک نہ گئی کیسا نیک
اور شریف کہ قلعہ کے ایک لڑکے کو یہ بات نصیب نہ تھی۔ ہم کھا چکے تو چار گھڑی
دن باقی تھا ارادہ کیا کہ آگے بڑھیں۔ مگر اس نے نہ جانے دیا۔ مجھے اس کے
بھولپن پر بہت ہنسی آئی کہنے لگا۔ "میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ ہم دو ماں بیٹے اس میں
رہتے ہیں۔ تم لوگ رات کو مزے سے سوؤ میں بھی رہوں گا" شام کو وہ اپنی ماں کو
بھی لے آیا۔ اور دو گھڑے پانی بھی بھر دیئے۔ ایسی محبت کے لوگ میں نے تو عمر بھر نہیں
دیکھے۔ جب ہم جانے کا نام لیتے وہ لڑکا منہ بنا کر کھڑا ہو جاتا اور کہتا
"ملئی اور باجرا خدا کا دیا بہت ہے۔ یہیں رہو اور کھاؤ اللہ سب مشکل آسان کرے گا"
میرے میاں نئے دولہا جن کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ بچنے کی اُمید کیا
گھڑی ساعت پر تھے۔ بغیر دوائی ٹھنڈائی کے ایسے اچھے ہوئے کہ اچنبا ہو گیا بخار
اُتر گیا اور جنگل کی ہوا اور پانی نے وہ طاقت دی کہ سب دنگ رہ گئے۔

بیچارے امرو نے ہمارے واسطے نہر کے کنارے ایک جھونپڑی ڈال دی
وہ دونوں ماں بیٹے بھی وہیں آگئے۔ یہاں چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ کوئی سات آٹھ
نیم کے درخت تھے اور دو تین املی اور جامن کے۔ ہم یہاں خوش تھے۔ مگر ایک
بات کا مجھ پر بڑا بوجھ تھا۔ کہ اس غریب سے رشتہ نہ ناتا۔ مفت کی روٹیاں توڑ
رہے ہیں، خالہ نے ایک دن اس سے کہا کہ تم مجھ کو تھوڑا ریشم اور ایک کرتہ کی ململ

لادو۔ وہ جاکر لے آیا تو انھوں نے تین چار ہی دن میں ایسا کاڑھا کہ وہ تو وہ جس نے دیکھا وہی تعریف کرنے لگا۔ اب تو یہ کیفیت ہوئی کہ چاروں طرف سے لوگ آنے لگے اور ہماری کڑھائی کی دُور دُور خبر پہونچ گئی۔ امرو نے خرچ لینے سے انکار کردیا تو ہم نے یہ ترکیب کی کہ اس کا کپڑا مفت کاڑھ دیتے تھے اور وہ اس کو بیچ لاتا تو دام نہ لیتے اس طرح اس کا خرچ بھی پورا ہوتا اور ہمارا بھی۔

اب ہماری گذران خوب ہونے لگی معلوم ہوا کہ شہر یہاں سے بیس اکیس کوس ہے اور امن چین بھی ہوگئی ہے۔ مگر دل کچھ ایسے مرگئے تھے کہ جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دم بدم کی خبریں آتے جاتوں سے معلوم ہوتی رہتیں تھیں۔ جس کو پوچھا یہی پتہ چلا کہ پھانسی ہوگئی یا بھاگ گیا۔ چچا حشمت میں جان بڑی تھی۔ کئی آدمیوں سے کہا کہ ان کی خبر لاؤ۔ مگر کسی کو گھر نہیں ملا۔ آخر ایک دن ننھے دولہا ہی دل کو کڑا کرکے پہونچے۔ اُپلوں کی گاڑیاں شہر جارہی تھیں اور ان کا چودھری امرو کا پھوپا تھا وہ بھی ساتھ ہولیا اور دو بجے سے یہ لوگ روانہ ہوگئے کہ نو دس بجے تک ڈنڈی پہ پہونچ جائیں گے اور سویرے ہی سویرے بیچ کھوچ بارہ ایک بجے چل کھڑے ہوں گے۔ رات کو کہیں گیارہ بجے گاڑیاں لوٹیں تو ننھے دولہا نے کہا کہ۔

"شہر تو آدھے سے زیادہ کھد گیا۔ گھروں کا پتہ ہے نہ گھر والوں کا۔ چچا حشمت کا گھر تو باقی ہے مگر ان کا پتہ نہیں۔ برابر میں ایک روٹی والا رہتا ہے اس سے اتنا معلوم ہوا کہ بال بچوں کو لے کر کہیں نکل گئے اب تک کوئی خبر نہیں کہ جیتے ہیں یا مر گئے ہاں ایک مخبر نے یہ بھی کہا کہ ان کے چھوٹے لڑکے کو تو پھانسی ہوگئی۔"

حسنو تو میری گودیوں کا کھیلا ہوا تھا۔ سنتے ہی جان نکل گئی۔ رونے روتے ہچکی بندھ گئی۔ شہر جانے کا اوّل تو ارادہ ہی نہ تھا۔ اور اگر تھوڑا بہت خیال کبھی بھولے بسرے آبھی جاتا تھا تو اب بالکل نفرت ہوگئی۔"

برجیس دولہن اپنی داستان یہاں تک پہنچاکر پان کھانے کے واسطے اُٹھیں تو گوہری نمبو میں بیگو کی وہی صدا گونجی۔

"لپٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

اتنا کہہ کر بیگو نے جھبیوں سے کپڑے اُٹھائے تو نمبو خوشبو سے مہک اُٹھا گوہرآرا بیگو نے کہا "پہلے درود پڑھو اور پھر حضور کی مغفرت کے واسطے دعا کرو"

اس وقت تین بج چکے تھے اور چاند خواتین مغلیہ کی بربادیٔ ناموس پر ماتم کرتا ہوا بساط فلک سے لپیٹ لپیٹ کر وداع ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں نے اس کے بعد بڑی بڑی مجلسیں دیکھیں اور کانوں نے اچھّی اچھّی تقریریں سُنیں مگر برجیس دلہن کا نالہ سرزمین تنا جھ جہاں آباد پر اس درد سے گونجا کہ اس کی کسک اب تک دل میں موجود ہے۔ زندگی کی بہت سی بہاریں دیکھیں اور ماتم کئے مگر بیلہ میں جو میلہ دیکھ لیا اب وہ سماں نظر نہ آئے گا۔ بدبخت شہزادیوں کی صدا سفید ڈاڑھیوں پر آنسوؤں کے موتی لُٹا اور خانماں برباد بیبیوں کی داستان جوانوں کے کلیجے توڑ رہی تھی! جس طرح موسم برسات میں پوروا ہوا کے ساتھ جسم کی پُرانی چوٹیں اُبھرتی ہیں اسی طرح جب کبھی بیلے میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہ رات اور وہ صورتیں آنکھ کے سامنے آجاتی ہیں۔ مگر بیلے والے خوش نصیب تھے کہ اپنے ساتھ بیلے کو بھی لے گئے اور آج اس کے گھندار درختوں اور جھاڑیوں کا جن کے دامن شہر آبادی کی تاریخ سے مالامال تھے ایک ذرہ بھی موجود نہیں جو صحبت شب کا نشان دے اور حق یہ ہے کہ مکین و مکان سب فنا ہوگئے اور مجھے تو اب کوئی صورت بھی ایسی نظر نہیں آتی جس نے اس بزم کی شمع جھلملاتی دیکھی ہو۔ بیلے میں میلے کی آخری یادگار "پھول والی بیگم" اس کے بعد بیس سال

کے قریب زندہ رہی۔ کمر جھک گئی اور دانت بھی ٹوٹ چکے تھے۔ مگر "بڑیوں کے کٹرہ" میں جن دو کانوں کے پاس شاید اب ڈاکخانہ ہے اس کی آواز نے رات کے سناٹے میں مدتوں کہرام مچایا ہے۔ میں اور میرے عزیز دوست شہزادہ مرزا محمد اشرف صاحب بی۔ اے گورگانی بیگم کے مرض الموت میں عیادت کو گئے تھے کہ شاہانِ مغلیہ کی اس جیتی جاگتی تصویر کو آخری مرتبہ جی بھر کر دیکھ لیں۔ اس رات کے ذکر پر بیگم کے آنسو نکل پڑے۔ آج بیگم اور مرزا دونوں شاہجہاں آباد سے کیا اس دنیا سے رخصت ہو چکے مگر بیگم کی زندگی اب بھی جب بیلے میں جاتا ہوں وہ اُجڑا ہوا سماں سامنے لا کھڑا کرتی ہے پھولوں کی مہک نے اور بیگم کی لہکا نے کہ

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

برجیس دلھن کی بپتا کو فراموش کر دیا۔ جب دُعا ہو چکی تو چار بج رہے تھے بادشاہ کا نام آتے ہی کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسو نہ نکل رہے ہوں برجیس دلھن کی داستان ابھی ختم نہ ہوئی تھی اور خیال تھا کہ وہ نماز سے پہلے اپنی مصیبت سنا دیں گی لیکن گوھرا را بیگم نے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ دلّی والوں کو یہ راتیں پھر نصیب نہ ہوں گی اور ان کا جی نہ چاہتا ہوگا کہ جلسہ ختم ہو مگر زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر رات اور سمجھ لو برجیس دُلھن تھک گئی ہیں اس لئے اب باقی کتھا رات کو"

جحّن صاحب کے احاطہ والے خلیفہ رجبو بخش بنیراک جن کے بیٹے ننّبی اب بھی زندہ ہیں، اسی صبح کو جمنا میں ڈوب کر مرے۔ اِن کی بابت سُنا ہے کہ وہ پالتی لگا کر اس پار سے اُس پار حقّہ پیتے نکل جاتے تھے۔ اِن کے ڈوبنے کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ مگر نے ان کا خاتمہ کیا۔

بسنت کا اصلی میلہ تو ایک دن کا تھا۔ دِلّی والوں نے اپنی دھینگا دھینگی دن بڑھا لئے تھے۔ خلیفہ جی کی موت سے میلہ کچھ اُکھڑ سا گیا "قاضی کے حوض" سے لے کر ادھر "نئے بانس" تک اور اُدھر پھاٹک تہر اور موری دروازہ تک "بھوری والوں" نے دو کانیں کھولیں۔ ہاں "خوجی والے" "چرخی والے" اور "شیخو والے" میلہ مناتے رہے مگر آج روز کی سی گہما گہمی نہ تھی۔ لیکن شام ہوتے ہی خلقت ٹوٹ پڑی "گوہری تمبو" اور میدان آدمیوں سے پٹ گیا۔

شہزادیاں قلعہ میں تو پہلے ہی پردہ نہ کرتی تھیں اب غدر نے پردے کو بالکل ہی صفایا کر دیا تھا۔ عشا کی نماز "نگبود دروازے" ہوئی اور دس بجے ہوں گے کہ بیگم کی آواز گونجی

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

ٹھیک تعداد تو یاد نہیں مگر پھولوں کے چھبیے پندرہ بیس سے کم نہ ہوں گے۔ وہ آج کل کے دن نہ تھے کہ ہر چیز پر آگ پڑ رہی ہے۔ پیسے پیسے کی ڈھیریاں الگ لگی ہوئی تھیں۔ دو گھنٹہ میں دو کے سوا سب چھبیے خالی ہو گئے تو بیگم کی آواز پھر گونجی۔

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

گوہر آرا بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"بس بیگم اب بیان شروع کرو اور یہ تبرک رکھ لو" اتنا سنتے ہی بیگم نے چھبیے ڈھانک دیئے۔ برجیس دلھن آ کر بیٹھیں اور کہا۔

"میں یہ تو کل کہہ چکی ہوں کہ حسنو مباں کی پھانسی کی خبر سے میرا دل زندگی سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس بچے کو میں نے اپنے ہاتھ سے پالا تھا۔ بہتیرا بہلاتی تھی مگر دل کسی طرح ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ آخر میں نے نئے دولہا سے کہا کہ "میرا جی یہاں سے گھبراتا ہے اب یا تو شہر چلو یا بیدھڑ مند اُٹھے" وہ راضی ہو گئے اور ہم نے جانے کا ارادہ کیا تو اعدوا اور اس کا سارا گھر منتیں کرنے لگا۔ مگر میرا دل

اُکھڑ گیا تھا آخر یہ صلاح ٹھیری کہ میرٹھ یہاں سے تین کوس ہے وہاں چلیں
میری ایک رشتہ کی پھوپھی وہاں تھیں اور مجھ سے محبّت بھی بہت کرتی تھیں
ٹھیرنے کا ٹھکانا موجود تھا۔ چالیس پچاس روپے بھی پاس ہو گئے تھے۔ گاؤں
والوں کو روتا چھوڑ آخر میں اور ننھے دولہا میرٹھ روانہ ہو گئے۔ گاڑی والا تھا تو بڈھا
مگر مزاج کا بہت ہی کڑوا۔ ہم صبح ہی چلے تھے شام کو "بیگم آباد" میں قیام کیا۔
ایک ٹوٹی ہوئی سرا میں ٹھیرے۔ رات گذری کھانا ہمارے ساتھ تھا۔ صبح اُٹھ کر آگے
بڑھے اور چار بجے میرٹھ پہنچ گئے۔ پھوپی جان کو بہتیرا ہی ڈھونڈھا مگر خاک پتہ
نہ ملا۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ غدر میں دونوں میاں بیوی دِلّی جا کر مر گئے۔ اب
اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ یہاں بھی سرا میں گئے۔ بھٹیاری کمبخت ایسی خردماغ
کہ خدا کی پناہ۔ بات کرو تو کاٹنے کو دوڑے ہر وقت یہ کہتی تھی کہ تم مخبر ہو۔ ہم کو
وہاں ٹھیرے چوتھا روز تھا کہ ننھے دولہا بخار میں لوتھ ہو گئے میرٹھ میں خاصی
امی جمی ہو گئی تھی۔ حکیم کا نسخہ تھا اس نے کہا "موتی جھرا ہے" آٹھواں یا نواں
دن تھا کہ ان کی حالت بگڑنی شروع ہو گئی۔ گھس لگانے کو آدمی نہیں۔ آخر
میں ہی باہر نکلی اور برقعہ اوڑھ حکیم کے ہاں پہنچی۔ انھوں نے انسانیت برتی کہ
میرے ساتھ آ گئے اور نبض دیکھ کر نسخہ بدلا۔ مجھ سے تو یہ کہا کہ "گھراؤ نہیں اللہ مالک
ہے" اور بھٹیاری سے کہہ دیا "یہ مر جائیں گے۔ ہوشیار رہنا" وہ نامراد آئے
تو جائے کہاں۔ ننھے پلنگ سامنے آ کھڑی ہوئی کہ "کوٹھری ابھی خالی کرو" بیمار
کی حالت بگڑ رہی تھی۔ میں نے بہتیرا سمجھایا منّت خوشامد کی لیکن وہ کمبخت کیا ماننے
والی تھی۔ اپنے دو بھٹیاروں کو اور لے آئی کہ ہماری سرا بدنام ہو گی۔ غرض اس میں
سے مردہ نکلے۔ میں روتی ہوئی سڑک پر جا بیٹھی۔ دو تین مرد میرے ساتھ آئے اور
ان بے ایمانوں کو ڈانٹا۔ بیمار کو دیکھا سانس اُکھڑ رہا تھا۔ وہ اتنے بھلے مانس تھے کہ

وہیں بیٹھ گئے۔ شہد لائے یٰسین سنائی۔ رات کے تین بجے ہونگے کہ غلطے دولھا رخصت ہوئے
میرٹھ کے یہ تینوں آدمی فرشتے تھے جن کو خدا نے بھیجا تھا میرے پاس ایک پھوٹی
کوڑی نہ تھی انھوں نے ہی اوّل منزل کیا۔ اور ہمارا کرایہ بھی ادا کیا۔ میں ٹھیک دوپہر کو
باہر نکلی تین پیسے میرے پاس تھے۔ کہاں جاتی اور کہاں پڑتی۔ ایک پیسے کے چنے
چبائے اور رات کو "مدار دروازہ" کی سڑک پر بیٹھ کر صبح کر دی۔ یہ دن اور رات بھی
یوں ہی گذری اور وہ دو پیسے بھی ختم ہو گئے۔ مجھ پر دو وقت کا فاقہ تھا۔ مگر بھیک
مانگنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ایک پختہ حویلی دکھائی دی۔ بسم اللہ کہکر اندر گھسی اور
گھر والی بی بی سے کہا "آپ کو ماما کی ضرورت ہے؟" وہ تو ایسی کھنوڑی تھی کہ جواب
بھی نہ دیا۔ ہاں میاں نے کہا کہ "اندر آؤ بی کون ہو، کہاں کی رہنے والی ہو۔ کیا تنخواہ لوگی؟
میں نے کہا "جو آپ دینگے" اس پر میاں بیوی میں کچھ صلاح ہوئی اور مجھ کو ایک روپیہ
مہینہ کھانے پر نوکر رکھ لیا۔

میاں جس قدر شریف تھے بیوی اسی قدر کمینی۔ کمبخت کی سمجھ میں کوئی کام ہی
نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے تین چار مہینے کاٹے۔ ایک دن مرچوں پر جھگڑا
ہوا کہنے لگی "تم نے مرچیں زیادہ کر دیں" میں نے کہا "کمبخت! نوکری طے کر رکھ ہاتھ
بیچے ہیں ذات نہیں بیچی" میں اتنا کہہ برقع اوڑھ باہر نکلی۔ پیچھے پیچھے میاں
آئے۔ بہتیری منت خوشامد کی۔ مگر میرا دل اکھڑ گیا تھا میں نہ ٹھیری۔ دو روپے میرے
پاس تھے۔ ایک روپیہ چڑھا ہوا تھا وہ نہ ملا۔ نو آنہ اونٹ گاڑی کا کرایہ دے کر گھر آئی۔

اب زندگی کا مزہ نہیں ہے۔ ہر نماز کے بعد دعا کرتی ہوں کہ جہاں سب گئے خدا
مجھے بھی وہیں پہونچا دے "اور میرا پردہ ڈھانک لے"

میری وہ راتیں جو بیلے میں بسر ہوئیں زندگی کی بہترین راتیں تھیں۔

شہزادیاں بھی قلعے اور بادشاہ کو آتنا نہ روئی ہونگی جتنا میں دلّی اور دلّی والوں کو روتا ہوں۔ عمر گذشتہ کی یاد بڑھاپے میں سوہانِ روح ہوتی ہے۔ کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے اور جب جوانی کی بہاریں سامنے آتی ہیں تو گذرے ہوئے دن اور بیتی ہوئی راتیں نیزہ بن کر دل میں گھستی ہیں۔ مگر جس کی جوانی بھی بڑھاپے سے بدتر ہو، جو پیدا ہوا تو روتا ہوا، اور زندہ رہا تو روتا ہوا، جس کے قہقہے بھی آنسوؤں میں شرابور، اور جس کی مسرت بھی افکار سے لبریز، وہ روئے گا تو اپنے آنسوؤں پر، بلبلائے گا تو اپنے آلام پر! زندگی کا وہ فانی دور جو جوانی کے نام سے تعبیر ہوتا ہے۔ مجھ پر بھی گذرا ہے۔ فطرت انسانی کے اس اصول سے میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں۔ مگر جوانی جب یاد آتی ہے۔ اس کے پہلو میں ہمیشہ بچھڑی ہوئی صورتیں دیکھی ہیں۔ دلّی اور دلّی والے پیلے کے جیسلے میں جن گھروں کو رو رہے تھے وہ تو خیر رخصت ہو ہی چکے تھے۔ ستم پر ستم یہ ہے کہ وہ رونے والے بھی نہ رہے اور میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے سب اُٹھ گئے! میں ان راتوں میں رونے والوں کا ہمنوا تھا! آج تنہا ہوں اور کوئی اتنا بھی نہیں جو میرے آنسوؤں کی ہاں میں ہاں ملا دے!!

جی تو یہی چاہتا ہے کہ "پھول والی بیگم" کی لہکار اور جھنکار پر جو کانوں میں گونج رہی اور دماغ میں بس رہی ہے، جب تک زندہ ہوں عقیدت کے پھول چڑھاتا رہوں، مگر سننے والے اُکتا جائیں گے اس لئے چھوڑتا ہوں اور اصل مقصد پر رجوع کرتا ہوں۔

برجیس دلہن کی داستان ختم ہو چکی تو پھر وہی صدا گونجی

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

خلقت بھر ٹوٹی جو ڈھیریاں باقی رہ گئیں تھیں وہ ختم ہو گئیں تو گوہر آرا بیگم نے کہا۔

مینا بازار

"برجیس دولھن کی داستان ادھوری رہ گئی تھی اس لیئے پہلے وہ ختم ہوگئی بادشاہ کے لیئے دعا ہو چکی۔ مگر دلی والوں! بادشاہ کہاں! بلبل اُڑ گئی خالی پنجرے کو بیٹھ لو۔ روح نکل گئی جسم باقی ہے۔ تم نے صاحب عالم کا بگڑا ہوا وقت دیکھا۔ جن باتوں کو رو رہی ہوں یہ زوال کے دن تھے ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے اچھے رنگ دیکھ لیئے قلعہ میں مینا بازار کی سیر ایسی دیکھی کہ اب تم کو نظر نہ آئیگی چھتیسے ۳۶ کال کی وجہ یہ ہے جب آٹا ڈیڑھ من سے چھتیس ۳۶ سیر کا رہ گیا۔ مخلوق چیخ اُٹھی اور کہدیا کال پڑگیا۔ حضور نے حکم دیا کہ مینا بازار کی ساری آمدنی کنگلوں کو دے دو۔ بات فقط اتنی تھی کہ ساون کے تیرہ دن نکل گئے اور مینہ نہ برسا۔ آدھا اساڑھ خاصا برساتھا۔ غریبوں نے تیرہ ہی دن کو تیرہ برس بنا، آٹا گھٹا دیا۔ یہ بادشاہ اور رعیت کے راز و نیاز ہیں چھتیس ۳۶ سیر کا آٹا ہوتے ہی رعیت نے چھتیسا کال اس کا نام رکھ دیا۔ اور حضور نے مینا بازار کی پوری آمدنی کنگلوں کی نذر کردی۔ کوئی انگریز ولیم صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جگہ جگہ کی تصویریں اتارلیں۔ مینا بازار کی تصویر مجھے بھی صبح کو کوٹھری میں پڑی مل گئی سنتی ہوں کہ اب ولایت میں اس کی بڑی قدر ہو رہی ہے"

تصویر کا نام سنتے ہی لوگ گرنے شروع ہوگئے۔ لیکن گھنٹہ بھر سے زیادہ ہوگیا تو گوھرارا بیگم نے ایک ہاتھ میں شمع لی اور دوسرے ہاتھ میں تصویر لیکر کہا "دور سے نیت بھر کر دیکھئے۔ یہ مینا بازار کی تصویر ہے۔ آگے چل کر مینا بازار تو کیا تصویر بھی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ یہ وہ تصویر ہے کہ حضور کی منجھلی بہو افروز دلھن تاج رکھے موتیوں کا ہار خرید رہی ہیں اور عورتیں ان کو مال دکھا دکھا کر منہ مانگے دام لے رہی ہیں"

جب سب لوگ تصویر دیکھ چکے تو گوھرارا بیگم نے کہا "اب ہماری ننھی حیدری اپنی داستان سنائیں گی۔ نیرہ چودہ برس کی عمر میں خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھان لی"

بی ننھی حیدری مسکرا رہی تھیں کہ پھر آواز گونجی

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

گوھرارا بیگم نے کہا "اے ہے بیگم بس کرو۔ دیکھو تو آدھی سے زیادہ رات باتوں ہی باتوں میں گذر گئی خلقت بے چین ہو رہی ہے۔ بیگم نے قہقہہ مارا اور کہا "آپا پھول تو ختم ہو گئے اب رکھا ہی کیا ہے۔ میں تو ہنس رہی ہوں" اس پر سب ہنس پڑے اور ننھی حیدری نے اپنی بیتی اس طرح سنائی۔

ننھی حیدری کی آپ بیتی

"میرے گھر میں سوائے ابّا میاں کے اللہ کا نام تھا۔ باپ تھے تو وہ اور ماں تھے تو وہ۔ بہن بھائی کوئی ہوا ہی نہیں۔ نانی دادی کی صورت بھی نہ دیکھی کسی بڑی ضرورت کو بھی گھر سے نکلتے تو اوپر کی کنڈی لگا کر جاتے۔ جب غدر کا پہاڑ گرا تو وہ بیچارے آس نہ پاس لیکن کالے مخبر نے میرے بے قصور ابا میاں کو پکڑوا دیا اور اتنی سی بات پر کہ اس کے لڑکے سے انھوں نے میری شادی کیوں نہ کر دی۔ مجھ پر جو کچھ گذری کیوں کر کہوں اور کس سے کہوں، دو دن اور دو رات جا نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہی۔ تیسرے دن صبح ہی اس نے آ کر کہا "تیرے باپ کو پھانسی ہو گئی۔ تو میری بھتیجی ہے۔ اب تیرا نکاح میں اپنے لڑکے سے کرونگا"، اب کوئی اللہ کا بندہ بتائیے کہ میں کیا کرتی؟ ابا میاں کی پھانسی کالے بے ایمان کی بدمعاشی، نکاح کا ڈر، کس کس چیز کو روتی۔ یہ

تیسرا دن بھی فاقہ سے گذرا۔ تیسرے پہر کو اس نے آکر کہا وہ آج مغرب عشا کے درمیان تیرا نکاح ہے۔ یہ سنتے ہی جان نکل گئی۔ شام پکڑنی مصیبت تھی ادھر جھٹ پٹا ہوا اُدھر میں نے ابا میاں کی اچکن پہن صافہ باندھا اور لکڑی ہاتھ میں لے باہر نکل گئی۔ ساری رات منہ اُٹھائے چلی گئی۔ پلٹ کر نہ دیکھا صبح مجھے جنگل میں ہوئی مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ کالا پیچھے آرہا ہے، پھر چلی شاید دس بجے ہوں گے۔ ایک گاؤں کے چوراہے پر مٹی کی چینی میں خشکہ رکھا ہوا تھا۔ ڈر وَر سب بھول گئی۔ بڑے بڑے نوالے مار آگے بڑھی۔ پیاؤ پہ پانی پیا اور چل دی۔

مجھے نہ تو یہ خبر تھی کہ دن کہاں ہے نہ یہ کہ رات کدھر آئی اور گئی۔ یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ کتنے دن اور کتنی راتیں اس طرح گذریں۔ جس گاؤں پہنچتی بھیک سے پیٹ بھر لیتی اور آگے بڑھ جاتی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ اسی طرح گذرا ہوگا آخر تھک کر چور ہوگئی۔ پاؤں لہولہان ہوئے اور جب ایک دن دوپہر کے وقت بخار شدت سے چڑھا تو ایک درخت کے نیچے ٹھٹکی۔ کالے کمبخت کا ایسا ڈر سوار تھا کہ بخار میں بھی اسی مردود کی صورت سامنے آتی دکھائی دیتی تھی۔ سامنے ایک پہاڑ تھا وہاں گئی تو اس کے نیچے ایک کھو میں پڑ گئی۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک وہاں سوئی۔ گھنٹہ بھر یا دن بھر۔ آنکھ کھلی تو بخار اُتر چکا تھا۔ مگر کمزوری کا یہ حال تھا کہ بات نہ کی جاتی تھی۔ چاروں طرف دیکھا آدمی نہ آدم زاد۔ پیاس کے مارے کانٹے زبان پر پڑ رہے تھے۔ مگر پانی کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اس جنگل بیابان میں اس سنسان پہاڑ پر ایک طرف سے کچھ گانے کی سی آواز آئی۔ اسی آواز پہ چل کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دور جا کر کیا دیکھتی ہوں کہ ایک آبشار ہے اور پاس ہی ایک چشمہ صاف شفاف پانی کا لہریں لے رہا ہے۔ اِدھر اُدھر خوش رنگ پھولوں کے پودے

ہیں اور جس وقت ہوا ان پھولوں کو سرسراتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام پہاڑ ہنس رہا ہے کیسی بہار تھی کہ سبحان اللہ! میں نے پانی پیا تو کتنا شیریں کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ پہاڑی درخت میوؤں سے لدے کھڑے تھے۔ بھوک کے مارے بیتاب تھی۔ خوب توڑے۔ خوب کھائے۔ مگر باجے گانے کی آواز اب تک برابر آ رہی تھی اور اب تو بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ آگے بڑھی تو دور سے ایسا معلوم ہوا کہ وہ باجے کی آواز پونگی ہے اور کوئی شخص تنہا کبھی پونگی بجاتا ہے کبھی گاتا ہے یہاں تک کہ ایک شخص دکھائی دے گیا۔ دور سے کھڑے ہو کر دیکھا کہ کہیں کالا نہ ہو۔ جب دیکھ لیا کہ ایک بڈھا سپیرا ہے تو پاس پہنچ گئی۔ سپیرا اپنی بین میں مست خود بھی جھوم رہا تھا اور اس کے سامنے دو سانپ کالے بھونرے پھن اٹھا اٹھا کر اس کی گود میں کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر سپیرے نے پونگی چھوڑ دی اور ایک سانپ کو ہاتھ پکڑ کر مجھ سے پوچھا "بابا کون ہے؟ کیوں آیا ہے"۔ میں ایک کونہ میں خاموش بیٹھ گئی۔ سپیرا میرے قریب آیا۔ بڈھا پھونس تھا۔ پلکیں تک سفید تھیں اور تمام جسم پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے تمام کیفیت بیان کی وہ ایسا مہربان ہوا کہ اسی وقت اپنے ہاتھ سے پھل توڑ کر کھانے کو دیئے اور کہا "بیٹی یہ نیلگری پربت ہے تو شوق سے رہ۔ میں تجھ کو اپنی بیٹی سمجھوں گا"۔ اس نے مجھ سے اپنی حالت بیان کی کہ راجہ سمیر پور کا بھانجہ ہے۔ ایک جوان لڑکی عمر بھر کا سرمایہ تھی جس کو مرے پندرہ بیس برس ہو گئے اس کی موت کے سے گھر بار چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل آیا اور یہاں زندگی بسر کر رہا ہے۔ مجھے اس کی زندگی پر رشک آتا تھا کہ کوئی رنج و غم اس کے پاس آ کر نہ پھٹکتا تھا۔ قدرت کا دسترخوان انواع اقسام کی نعمتیں ہر وقت اس کے واسطے حاضر تھیں اور ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے ہر لمحہ اس کی دعوت میں مصروف تھے۔ میں بھی ہر طرح سے بے فکر تھی۔ وہ مجھ کو بیٹی

سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی محبوب و مرغوب چیزیں سانپ تھے ہر وقت کھیلتا اور مگن رہتا
ایک روز اس نے مجھ کو ایک بوٹی دکھائی کہ کیسا ہی زہریلا سانپ ہو یہ تریاق ہے
اگر ایک قطرہ بھی حلق سے اُتر گیا تو آدمی مر نہیں سکتا۔ کوئی دو مہینے بعد میرا سپیرا پہاڑ
سے اُترتا ہوا لڑھک گیا۔ اور ایسا گرا ہڈی پسلی چکنا چور ہو گئی۔ اب میرا یہاں ٹھیرنا
فضول تھا اور میرا دل بھی اس کے بعد نہ لگا۔ میں یہ کہنا بھول گئی کہ میرے کپڑوں
کی دھجیاں لگ گئی تھیں۔ ایک گیروا چادر سپیرے نے مجھ کو دے دی تھی وہی میرے
بدن پر تھی۔ صبح کے وقت ایک دن میں وہاں سے چل کھڑی ہوئی۔ شام کے
قریب ایک شہر میں پہونچی۔ دلی چھوڑے مدتیں ہو گئیں تھیں۔ شہر کی صورت
دیکھتے ہی دل کی کیفیت کچھ اور ہو گئی اور اپنا گھر یاد آیا مگر کجا دلی اور کجا میں!
ٹھنڈا سانس بھر کر سڑک پر بیٹھ گئی۔ سامنے دیکھا تو آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ
لگے ہوئے ہیں۔ دس جاتے ہیں اور بیس آتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا
"تمہیں سانپ کے کاٹے کا منتر بھی یاد ہے"، میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے تو اس
نے کہا "ہمارے راجکمار کو ناگ نے ڈس لیا تھا"، میں نے کہا "کدھر ہے دیکھوں"
بوٹی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اندر جاکر دیکھا تو بائیس چوبیس برس کا لڑکا بیہوش
پڑا ہے اور سینکڑوں آدمی اِدھر اُدھر کھڑے افسوس کر رہے ہیں۔ اس کی ماں
پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ میری صورت دیکھتے ہی قدموں میں گری اور کہا "مہاراج
دیا کیجئے"۔ میں نے بوٹی پیس کر حلق میں ڈالی۔ خدا کی شان راجکمار نے آنکھیں
کھول دیں۔ اب تو سارا شہر میرے قدموں میں تھا۔ راجکمار کی ماں کو جب معلوم
ہوا کہ میں لڑکی ہوں تو اس نے مجھ کو اپنے ہاتھ سے نہلا دھلا کر کپڑے بدلے۔ اب
راجکمار بالکل اچھا ہو گیا تھا۔ میں نے چلنا چاہا تو وہ کہنے لگا "اگر تم جاتی ہو تو
مجھے بھی زندہ رہنے کی ضرورت نہیں۔ اسی سانپ کو بلاکر پھر ڈسوا دو"۔ میں نے

اُس سے حرف بہ حرف تمام داستان کہہ دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ دلّی کو دل ترس رہا ہے۔ اس کے حکم کی دیر تھی۔ وہ اور اس کے نوکر جاکر ساتھ ہو لئے۔ اور اب ہم سب آج سولھواں روز ہے کہ یہاں پہونچے، راجکمار بڑا رئیس ہے۔ تھا تو ہندو مگر اب سلمان سمجھ لو۔ نکاح کا خواستگار ہے۔ جو تم سب کا فیصلہ ہو تعمیل کروں"

ننھی حیدری کی داستان ختم ہوئی تو رات بھی ختم کے قریب تھی گوھرا بیگم نے فرمایا "بیویوں آج کی رات بھی ختم ہوگئی مگر ابھی داستانیں بہت باقی ہیں۔ آپ لوگ اکتا جائیں گے سچ پوچھو تو یہ داستانیں زبان پر نہیں تو دلوں میں اسوقت تک باقی رہیں گی جب تک شہر زندہ ہے اب اس کو ختم کرنا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ عمریں ختم ہو جائیں گی لیکن داستانیں ختم نہ ہوں گی دلّی والوں پہ جو خدا کا قہر ٹوٹا اور مصیبت آئی وہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے مجھ سے اگر سچ سچ پوچھو تو اس میں گوروں کا قصور ہے نہ فرنگیوں کا۔ سب سے پہلے تو تلنگوں نے آفت ڈھائی کہ شہر بھی لوٹا اور میموں کو بھی مارا۔ اس کے بعد مخبروں نے جن کی جھوٹی خبروں سے سینکڑوں نہیں ہزاروں بے قصور پھانسیوں پہ چڑھ گئے اور گور و کفن تک نصیب نہ ہوا۔ قیامت برپا کردی رہا صاحب عالم کا معاملہ وہ شہر کا بچّہ بچّہ جانتا ہے کہ ایسے بھولے بھالے ایسے سیدھے سادھے بادشاہ پر بغلی گھونسوں نے وار کیا اور جن کے نمک سے پیٹ بھر رہے تھے اس کو گھر سے نکال کر اپنے گھر میں گھی کے چراغ جلائے۔

یوں تو سارا شہر ہی مصیبت کا مارا ہے۔ بس آج اور کل دو راتیں اور سہی کل تک جن جن کی کتھا ہو جائے۔ باقی اب ختم کیجئے زندگی ہے تو پھر کبھی سہی، اگلے برس جب بیلہ میں میلہ ہوگا تو دیکھی جائے گی۔

ہم تو پھول والی بیگو کے قائل ہیں۔ ایک اکیلی نے سارے مخبروں اور اڑماروں کو ناک چنے چبوا دیئے۔ دنیا شہر چھوڑ چھاڑ بھاگ گئی مگر یہ اسی طرح شہر

میں دندناتی رہی۔ مجال نہیں جو کوئی آنکھ ملا سکتا۔ دو کو روٹی کھلا کر کھا رہی ہیں آدمی ہاتھ پاؤں ہلائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور اسی طرح عزت آبرو سے گذر بسر ہو سکتی ہے ہم شہزادیاں سچ پوچھو تو برقینچ کبوتر تھے۔ قلعہ سے چھوٹے تو اڑ کر کہاں جانے جنم نہ دیکھا بوریا۔ سپنے آئی کھاٹ۔ عمر رنگ رلیوں اور ایسے مردوں میں گذری۔ جو قید سے بدتر تھے اب جو اُڑے تو بازو ہیں سکت نہ پاؤں میں ہمت نیچے سے بلیوں نے دبوچا اوپر سے باز بہریوں نے خیر اب جلسہ ختم کرو۔ زندگی بہ خیر ہے تو کل رات کو گوری پھوپی اپنی داستان سنائیں گی۔ ہاں بی پھول والی بیگم لو اذان سے پہلے ایک صدا اور لگا لو ہاں بیوی۔

"ولیٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

بیویوں میں قہقہہ لگا۔ پھول والی بیگم بھی ہنسنے لگیں اور سب اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہی گوہر آرا بیگم آ موجود ہوئیں۔ دس گیارہ بجے رات تک کچریاں سی پکتی رہیں۔ آدھی کا عمل تھا کہ بیگو کی آواز گونجی۔

"ولیٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"

برجیس دولھن برابر بیٹھی تھیں بیگو کی آواز جو اُن کے برابر گونجی تو چونک پڑیں اور کہنے لگیں۔

"اے ہے خالہ ٹکی پڑے موئی لپٹوں کو میرے تو پردے بھی پھٹ گئے"

گوہر آرا بیگم نے کہا "اچھا بی خالہ! لو جلدی جلدی چھیبے خالی کرلو۔ دیر زیادہ ہوگئی ہے" خلقت ٹوٹ پڑی اور ایک آدھ ہی گھنٹہ میں پھول صاف ہوگئے تو گوہر آرا بیگم نے کہا "اب سب سے پہلے "گوری پھوپی جان" اپنی بیتی سنائیں گی" اتنا کہہ کر انھوں نے گوری کا ہاتھ پکڑ کر سامنے بٹھایا تو وہ ہنس کر کہنے لگیں۔

شہزادی قمر جہاں کی بپتا

"سب نے اب تک آپ بیتی سنائی ہیں جگ بیتی سناتی ہوں اور یہ ایسی ہے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ مجھ کو شہر آئے دو سال سے زیادہ ہوئے۔ میں نے کسی سے کچھ نہ کہا آج سب کے سامنے بیان کرتی ہوں۔

مجھ پر ایسی بپتا نہیں پڑی جس کا رونا روؤں۔ ہاں میں نے بارہ دری والی بجی کی لڑکی قمر جہاں کی جو مصیبت دیکھی وہ خدا دشمن کو نہ دکھائے۔ میرے آکا ابّا اجنٹی میں میر منشی تھے۔ کس مخبر کی مجال تھی کہ ہم سے آنکھ ملا لیتا بلکہ انھوں نے بیسیوں کو پھانسی سے چھٹکارہ دلوا دیا۔ اور موئے نصیرا مخبر کو جنٹ صاحب سے کہکر بیچ بازار میں پھانسی دلوا دی۔ ان کو ایکا ایکی کانپور جانے کا حکم ہو گیا۔ پچیس تیس آدمی ساتھ تھے اور بھی دو تین آدمیوں کے بال بچے تھے باقی سب مرد ہی مرد ہم شام کے لگ بھگ کانپور اترے وہاں امی جمی ہو چکی تھی مگر ننبیو راؤ ڈاکو یا باغی اب تک قبضہ میں نہ آیا تھا اس کے دو ڈھائی سو آدمی تھے۔ دن بھر جنگلوں میں رہنا اور رات کو جہاں جی چاہا پہنچا۔ مارا پیٹا اور جو ہاتھ لگا، لے چلتا ہوا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ ایک آدھ ڈاکہ نہ ڈالتا ہو اور دو چار آدمی نہ مارتا ہو"۔ آکا ابّا، کی بہادری مشہور تھی جنٹ صاحب نے اسی لئے ان کو کانپور بھیجا۔ جو لوگ ساتھ تھے وہ اُن کے ماتحت تھے اور خوب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رستے بھر انھوں نے جنگل میں منگل رکھا اور کانپور پہونچ چھاؤنی میں ڈیرے ڈال دیئے۔

شام ہو گئی تھی اس لئے رات وہیں گذری صبح کو چھوٹے بوچڑ خانہ میں آکا ابّا نے مکان کا انتظام کیا اور ہم دونوں ماں بیٹیاں وہاں چلی گئیں۔ ہمارے برابر ہی دیوار بیچ رسالدار احمد نبی خاں کا مکان تھا۔ وہ آکا ابّا سے مل کر

بہت خوش ہوئے اور ہماری دعوت کی۔ ہم دوسرے دن شام کو اُن کے ہاں گئے تو میں نے اِن کی بیوی کو دیکھا بہت ہنس مکھ اور اچھے مزاج کی بیوی تھیں مگر میں یہ دیکھ کر حیران تھی کہ جو لونڈی ان کے ہاں کام کاج کر رہی تھی وہ مجھ سے اپنا منہ چھپائے لیتی تھی میں نے گھر والی بیوی سے تو پوچھنا مناسب نہ سمجھا مگر اس تاک میں رہی کہ کسی طرح اس چھوکری کو دیکھ لوں۔ جب میں کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے اٹھی تو چھوکری کا گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ دیکھتی ہوں تو قمر جہاں! اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اگر وہی مجھے نہ پکڑتی تو میں گر پڑتی۔ اس نے سنبھالا اور اشارہ سے کہا "خبردار بولنا مت"۔ میں نے امّاں جان سے ذکر نہ کیا مگر کھانا کیا خاک کھایا جاتا۔ برائے نام دو چار نوالے کھا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ قمر جہاں کا نام اس گھر میں آ کر جنّتی ہو گیا تھا چلتے وقت میں نے رسالدارنی سے کہا اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی جنّتی کو ساتھ لے جاؤں پرایا محلہ اور اکیلا مکان ہے آکا ابّا اب چھاؤنی چلے جائیں گے"

رسالدار نے کہا "بیٹی شوق سے لے جاؤ"۔ میں باغ باغ ہو گئی اور قمر کو لے گھر آئی۔ امّاں جان کو معلوم ہوا کہ یہ قمر ہے تو گلے سے لگا کر اس قدر روئیں کہ ہچکی بندھ گئی۔ میں نے اسی وقت اس کو اپنے کپڑے دیئے نہلوایا اور کہہ دیا کہ "بس لونڈی گیری ہو چکی اب کسی کی مجال نہیں کہ تم پر حکومت کر سکے۔ تم بتاؤ تو سہی یہاں کیونکر آ گئیں"۔ قمر یہ سُن کر بہت روئی جب میں نے زیادہ کہا تو کہنے لگی "لو کیا بتاؤں تقدیر کا لکھا بھگت رہی ہوں اور دیکھئے کیا کیا لکھا ہے۔ لو سنو کیا بیتی

امّاں جان تو تھیں ہی نہیں، ابّا میاں کو جب پھانسی ہو گئی تو گھر میں مٹھی بھر آٹا بھی نہ تھا۔ دو راتیں تو میں نے جوں توں گذاریں مگر تیسرے دن دم آنکھوں میں آ گیا اور پانی کی بھی بوند نہ رہی تو رضائی اوڑھ باہر نکلی بھوک اور پیاس کے مارے جان نکل رہی تھی۔ ایک کرتہ پاجامہ کی بقچی بغل میں تھی۔ چاروں طرف

بھیک مانگی مگر خدا گواہ ہے جو کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ ہاں پیاؤ پر پیا
خوب ڈگڈگا کر پیا۔ آگے بڑھی تو سارا قلعہ جمعہ مسجد کے تلے جمع تھا وہاں پہونچی
سب رشتہ دار ملنے جلنے والے، مگر کچھ ایسی نفسی نفسی پڑ رہی تھی کہ کسی کو کسی کا
نہ تھا معلوم یہ ہوا کہ چنوں کی گاڑی گیارہ بجے آتی ہے اور سب کو مٹھی مٹھی بھر ملنے
بی کیا بتاؤں کہ کیوں کر گذری۔ مجھ میں تو چلنے کی بھی سکت نہ تھی زمین پر بیٹھ گ
اور آنکھیں بند کرلیں۔ گاڑی آئی تو خدا کی پناہ ایک پر ایک گر رہا تھا۔ دھکا
مکا، لات اور گھونسہ، مگر پیٹ بُری بلا ہے۔ پٹتی کٹتی پہونچی اور مٹھی بھر چنے ج
اس وقت پلاؤ سے زیادہ تھے دو ہی پھنکوں میں ختم کرلئے۔ چاروں طرف چ
کی طرح منڈلائی لیکن ایک دانہ نصیب نہ ہوا۔

جب رات ہوگئی تو ایک آدمی جس کے پیچھے پیچھے دو نوکر تھے روٹیاں بان
آیا اس نے مجھ کو بھی ایک روٹی دی۔ میں نے پانچویں روز روٹی کی صورت دیکھی
امرت ہوگئی۔ کھا کر پانی پیا۔ کئی وقت کے بعد جو پیٹ بھرا تو ایسی نیند آئی کہ
ہوش نہ رہا۔ وہیں سر رکھ کر میں لیٹ گئی۔ آنکھ کھلی تو خاصہ اُجالا تھا اس طرح تین
چار دن گذرے۔ شام کے وقت ایک دن دو تین فوجی آدمی آئے۔ ان میں
سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی مسلمان نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ چل ہمارے ساتھ
آ۔ روٹی دیں گے۔ میں ساتھ ہولی۔ اس نے اپنے گھر لاکر ایسا پیٹا کہ آج تک نہ
اُبھری۔ یہ وہی رسالدار ہیں اور یہ رسالدارنی اُن کی بیوی ہیں۔ کوئی آٹھ دس
میں وہاں رہی۔ پھر یہ لوگ یہاں چلے آئے، اب چاہے لونڈی باندھی کھو یا
اصیل۔ نماز کے وقت کی اٹھی ایک ٹانگ سے پھرتی ہوں۔ جب کہیں جا کر پیٹ
بھرتا ہے۔ بیوی تو خیر کچھ رحم بھی کرلیتی ہے۔ مگر رسالدار تو حقہ کو دم بھر دیر ہو جائے
یا نہ سلگے تو چھوٹتے ہی کوڑے سے بات کرتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ

کھال نہ اُدھڑے دیکھو سارا بدن نیلا ہو رہا ہے "

اتنا کہہ کر اُس نے کرتا اٹھا کر پیٹھ دکھائی تو اماں اور میں دہاڑوں رونے لگے اس کا جسم چوڑی تھا خدا خدا کرکے صبح ہوئی اماں جان نے آکا ابا کو ساری کیفیت سُنائی۔ انھوں نے قمر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹی تم گھبراؤ نہیں اپنے گھر آگئی ہو۔ اب رسالدار کے ہاں نہ جانے دوں گا" میں دیکھ رہی تھی کہ خوش ہونے کے بدلے قمر کچھ ڈرسی رہی تھی اس کا دل کچھ ایسا مر گیا تھا کہ ہنسی نام کو نہ آتی تھی۔ آکا ابا نے رسالدار سے کہا تو بہت پھیلے اور کہنے لگے کہ "ہم نے آپ کی اچھی دعوت کی کہ اپنا آدمی ہی ہاتھ سے کھویا آپ اس کو لے جا کہاں سکتے ہیں اس کا نکاح تو میرے نوکر نبو سے ہو چکا ہے" آکا ابا کو بھی غصہ آگیا اور انھوں نے کہا آپ کو معلوم بھی ہے یہ کون ہے۔ میری بیوی کی بھانجی! مرد خدا مسلمان ہو تمہارے آگے بھی بیٹی بھانجیاں ہیں۔ سدا دور ایک نہیں رہتا۔ خدا معلوم کل کیا ہوگا اس کے قہر سے ڈرو" رسالدار نے جبل و حجت تو بہت کی مگر آکا ابا نے ایک نہ سُنی اور لوچڑ خانہ کا مکان چھوڑ قمر کو ساتھ لے چھاؤنی میں آگئے۔

جب ڈاکو پکڑ لیا گیا اور اس کے ساتھی بھی پھانسی پر لٹک گئے تو آکا ابا دلی آگئے یہاں آئے شاید ساتواں مہینہ تھا کہ قمر کو بخار چڑھا جب سے آئے دن کی بیمار ہے۔ بخار چڑھتا ہے پھر اُتر جاتا ہے۔ پھر چڑھتا ہے۔ کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتا اب قمر ہڈیوں کی مالا ہے۔ دُبلی پتلی نازک مزاج لڑکی کو رسالدار ظالم کے کوڑوں نے زندہ درگور کر دیا! اب کوئی دن کی مہمان ہے یہاں آنے کو تڑپ رہی تھی مگر ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ خدا اس بدنصیب کا انجام بخیر کرے"

فاتحہ

گوری کی داستان ختم ہوئی تو رات فضا آسمانی میں کروٹ بدل رہی تھی۔

طبیعتیں گوری کے بیان سے متاثر ہو چکی تھیں اس پہ چند لمحہ کی خاموشی اور وداعِ شب کا درد انگیز سماں! دلوں کی کیفیت عجیب تھی مشکل سے گھڑی بھر اس طرح گذری ہوگی کہ برجیس دُلہن نے روتے ہوئے کہا۔

"بس دلّی والیوں ختم کرو روؤگے تو ہمیشہ مگر اب طبیعتیں سنبھالو اور اپنے اپنے دھندے دیکھو جو ہونا تھا وہ ہوگیا"

برجیس دلہن دوسروں کو سمجھا رہی تھیں مگر اُن کی اپنی حالت یہ تھی کہ ہچکی بندھی ہوئی تھی آخر گوھرارا بیگم نے اُن کو پانی پلا کر خاموش کیا اور فرمایا

"ہم ختم ہو جائیں گے مگر ہماری داستانیں ختم نہ ہوں گی۔ جب تک دنیا زندہ ہے ہمارا تذکرہ زندہ رہے گا۔ ہم پر جو قیامت ٹوٹی ہے یہ ایسی نہیں ہے کہ آدمی بھول جائے۔ ہماری بپتا دوسروں کے دل دہلا دے گی۔ گورے یا کالے جو کچھ بھی تھے ایسی آفت ڈھائی ہے کہ دلّی اور دلّی والے عمر بھر روئیں گے۔ مخبروں نے جو ستم توڑا ہے اور بیگناہوں کو پھانسیاں دلوا کر جیسے جیسے گھر اُجڑوائے ہیں اس کا بدلہ ہم اپنی آنکھ سے دیکھیں گے معصوموں کا خون اوپر ہی اوپر نہ جائے گا۔ ان چاروں نامراد مخبروں میں سے ایک کالے کی کھٹیا تو کٹ چکی دوسرا جمّو پاؤں بیٹھ رہا ہے باقی دونوں کا حشر بھی دیکھ لینا اب میلہ اور داستانیں ختم، زندگی ہے تو اگلے برس پھر دیکھ لیں گے۔

برجیس دولہن پانی پی کر سنبھل گئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ ایک دفعتاً صدا

"پلٹیں آرہی ہیں موتیا کی"

آواز گونجی اور پھول والی بیگم نے کہا، مرنے والے ایسے بدنصیب تھے کہ ان کے شہیدوں کو گور وکفن تک بھی نصیب نہ ہوا! پھول اور چالیسواں تو الگ رہے، ڈھونڈھیں بھی تو پتہ نہیں کہ کس کی قبر کہاں ہے! یہ جنّتی بندے ایسے بے وارث

تو نہ تھے کہ ان کی روحیں ترستی پھڑکتی سدھاریں اور دو روٹیاں تک نصیب نہ ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ غدر کے شہیدوں کا کل چالیسواں ہوجائے۔ ہو آگو ھر آرا بیگم اگر منظور کریں تو اس سے بہتر موقعہ کونسا ہوگا سارا شہر جمع ہے لیکن اس خالی خولی رونے دھونے سے کیا حاصل جو جس کو نصیب ہوا اپنا اپنا کھانا لے آئے اور یہاں مل بیٹھ کر اُن کے نام سے کھالیں،،

"پھول والی بیگم،، کی رائے سے سب نے اتفاق کیا اور جلسہ سے متفقہ آواز آئی کہ" بہت خوب۔ ضرور چاہیئے۔ کل ہم سب جو خدا نے دیا ہے اللہ چاہے مغرب کے وقت لے کر حاضر ہوجائیں گے۔"

اب پو پھٹ رہی تھی اور ہوا اور پرند روز روشن کی آمد کا غلغلہ بلند کر رہے تھے گوھر آرا بیگم نے کہا" اچھا بھائی بہنوں خدا حافظ اصل خیر سے شام کو پھر جمع ہوں گے اور آج اپنے مرنے والوں کا چالیسواں کریں گے۔"

جلسہ برخاست ہوا اور لوگ اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ شام سے پہلے ہی خلقت انواع واقسام کے کھانے لے کر آ پہونچی۔

افسوس ہے مجھے آج ٹھیک یاد نہیں مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ دیگوں کی گنتی نہ تھی چاروں طرف زردہ بریانی پھیلا ہوا تھا بلا مبالغہ سوسوا سو دیگیں ہوں گی۔ یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ کتنے اور کون سے خاندان شریک ہوئے تھے مجھے جہاں تک یاد ہے۔ شاید ہی کوئی گھر بچا ہوگا زمین آدمیوں کے کھانے سے پٹ رہی تھی۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے حبیب مخبر اور اس کا چھوٹا بھائی جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں۔ گوھر آرا بیگم کو دکھائی دے گئے دیکھتے ہی آپے سے باہر ہوگئیں اور کہنے لگیں۔

"ارے جوانا مرگ حبیب تو نے تھوڑی مصیبت توڑی ہے ا لم بخت پھلروا سے

بچّے تیری بدولت یتیم ہوئے! مہینہ دو دو مہینہ کی دلہنیں تیرے ہاتھوں رانڈیں ہوئیں! تونے بھرے پرے گھر اُجاڑے اور جوان شیروں کو جو ہمارے آس نہ پاس پھانسی پہ لٹکوا دیا! آج نیک بن کر کھانا کھلانے اور ثواب پہنچانے آیا ہے!! اسی وقت یہاں سے دور ہو اور نکل جا نہیں تو یاد رکھیو اتنی جوتیاں ماروں گی کہ بھیجا بلبلا ہو جائیگا تو سوچو ہے کھا کر بلّی حج کو چلی۔ سارے شہر کو پکڑوا کر گھر گھر کہرام مچوا چکا اب چالیسویں میں شریک ہوا۔ موئے بے غیرت۔ غارت ہو یہاں سے۔"

گوھرارا بیگو کا غصّہ لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ خلقت ان کے ساتھ ہو گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ دم بھر میں حمید کی تکّا بوٹی ہو جاتی کہ پھول والی بیگو نے آواز لگائی

"لپٹیں آ رہی ہیں موتیا کی"،

ایک صدا کے ساتھ ہی ایک قہقہہ گونجا اور خود گوھرارا بیگو کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، تو پھول والی بیگم نے کہا "بڑی آپا یہاں اس ناشدنی نے جو کچھ کیا آپ بھگتے گا۔ یہ جانے اس کا خدا جانے۔ تم نے سنا نہیں۔ مردہ دو جوانوں کو رو چکا لڑکے کی جیجانی لاش گھر سے نکلی۔ خاصی اچھی بھلی چنگی بیٹی گھڑی بھر میں چٹ پٹ ہو گئی۔ وہ کس بل سب نکل گیا اب تو اپنے کرتوتوں کو روتا ہے۔ یہ جانے اور اس کا خدا۔ آ گیا ہے تو آ جانے دیجئے۔ ایسا ہی ہے تو اس کے کھانے پر لعنت بھیجئے اور کتوں کو کھلا دیجئے۔ مگر زمین تو اللہ کی ہے ہم کیوں نکالیں"، پھول والی بیگو کے ساتھ بھی کچھ لوگ ہو گئے اور فیصلہ یہ ہوا کہ اس کے کھانے کو کوئی ہاتھ نہ لگائے بیٹھا ہے تو بیٹھا رہنے دو۔

حمید کا نام سنتے ہی چاروں طرف سے خلقت نے اسے گھورنا شروع کیا گو پھول والی بیگو کی رائے سے کچھ متفق بھی ہو گئے مگر ہر طرف سے ایسی لعن طعن ہوئی اس کو بیٹھنا مصیبت ہو گیا اور دونوں بھائی آنکھ بچا ایسے چمپت

ہوئے کہ پھر صبح تک ان کی صورت نہ دکھائی دی۔

دس بجے ہونگے یا بجنے والے ہونگے کہ مولوی نور اللہ خاں نے باآواز بلند فرمایا "جب یہ کھانا چالیسویں کا ہے تو ایصال ثواب کے واسطے ختم ہو اس کے بعد کھانا کھایا جائے۔" ان کی رائے پسند کی گئی اور بسم اللہ انھوں ہی نے کی۔

دلّی میں آج بھی بہت سے حافظ ہیں اور خدا کا شکر ہے رمضان المبارک میں یہ سینکڑوں مسجدیں آباد ہو جاتی ہیں اور شاید ہی کوئی مسجد ہو جہاں تراویح نہ ہوتی ہو۔ ختم بھی ہوتے ہیں۔ کلام اللہ بھی پڑھا جاتا ہے لیکن نہ معلوم اُس دَور کے حافظ کیسے تھے اِن کی آوازوں میں کیا جادو اور دل میں کیسا درد تھا کہ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ ہزارہا آدمیوں کا ٹھٹ مگر سانس تک کی آواز نہ تھی۔ شہر کے مشہور حافظ نور اللہ خاں کو پہلی مرتبہ میں نے وہیں سُنا اور دیکھا۔ حافظ وزیر نے باوجود دیکھا کے مصری لہجہ میں ایک رکوع اس طرح پڑھا کہ آنسو نکل پڑے۔ اس کے بعد تو مجلس کا رنگ ہی بدل گیا۔ سب کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ختم کے بعد سلیم سلطان نے نعت پڑھی اور دلوں کے ٹکڑے اڑا دیئے اور بیویاں بھی پڑھنے کا ارادہ کر رہی تھیں مگر گوہر آرا بیگم نے کہا کہ "بس اب پہلے کھانا کھایئے۔ گیارہ بجے ہیں ابھی ہو جائے گا۔"

کھانے میں خاصے ڈھائی تین گھنٹے صرف ہوئے۔ دو بجے کے قریب فارغ ہوئے تو اچھی خاں نے جو شہر کا مشہور گویا تھا بادشاہ کی ایک غزل سنائی اس وقت کی مجلس کا یہ حال تھا کہ کلیجہ منہ کو آرہا تھا مجھے غزل یاد نہیں مگر قدسی کی غزل پر بادشاہ کی تضمین تھی۔ اچھی کے بعد اور لوگوں نے بادشاہ ہی کی غزلیں پڑھیں اور یہ رات اسی طرح ختم ہوئی تو حافظ رحمت نابینا نے بلند آواز سے فرمایا۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

وہ یہ کہکر کھڑے ہوئے۔ وضو کیا اور ایسی اذان دی کہ میلہ گونج اٹھا نماز حافظ شمیم نے پڑھائی اور اس کے بعد ایک دفعہ اور غدر میں مرنے والوں کی پاک روحوں کو ثواب پہونچایا گیا اور بادشاہ کی مغفرت کی دعائیں ہوئیں۔

حمید مخبر

میلہ صبح ہی اکھڑ گیا تھا اور دلی والے اپنے اپنے کاموں میں پھنس گئے تھے کہ دو بجے کے قریب اسی حمید کی اچانک موت کی خبر شہر میں پھیل گئی اس کی موت کے واقعات اس قدر تعجب انگیز ہیں کہ بیساختہ خدا کی قدرت یاد آجاتی ہے

خاصا بھلا چنگا دن کے گیارہ بجے تک چاروں طرف پھرا محلہ کے ایک بڈھے آدمی کو مارا۔ کئی ایک کو گالیاں دیں، ایک ایک سے لڑا اور مرزا احمد سے تو یہاں تک کہا۔

”اکارات کو نو خوب پھیلے۔ تو بھی میرا نام حمید جو تم کو شہر کا رہنا ہی نہ بھلوا دوں جب میں مخبر ہی مشہور ہو گیا تو اب پوری مخبری کروں گا اور سب کو چھٹی کا کھایا یاد دلا دوں گا“

فیل کا فیل بنا ہوا تھا جس کی طرف منہ کیا وہی سہم گیا۔ ایک بجے دونوں ہاتھوں میں دو گنے لئے چوراہے کی طرف سے آرہا تھا سیدھے ہاتھ کو جھکڑا تھا الٹے ہاتھ پر اوپلوں کے گدھے۔ سامنے سے چمارنی شلجموں کا ٹوکرا لئے آرہی تھی بچکر نکلتا تھا کہ بڑھیا کی ٹکر لگی اس کی جھلی نیچے گری اور اس نے جوانی کے زور میں دو تین گنے سر پر ایسے مارے کہ غریب خونم خون ہو گئی مگر خرانٹ گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ عورت خون پونچھ اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹوکرا سر پر رکھ آگے بڑھی مگر نہ چلا گیا اور آگے جا کر پھر گری۔

حمید اینٹھتا ہوا چلا جا رہا تھا چلتے چلتے کلیجہ میں درد اٹھا۔ ”ہائے ہائے“

کہتا ہوا زمین پر گرا۔ خون کی نفے ہوئی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ آنکھیں پھر گئیں لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ گیا۔ جو تھا وہ لعنت بھیج رہا تھا اور خدا کی قدرت کے تماشے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بڑا بھائی چارپائی پر ڈال کر گھر لے گیا اور کسی حکیم کو لایا وہاں جا کر کیا گذری یہ تو خبر نہیں۔ ہاں یہ سنا تھا کہ کتے کی طرح ڈیڑھ دو گھنٹہ بھونکا۔ آخر اسی طرح تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ عصر کی نماز میں اس کا جنازہ مسجد میں آیا۔ مگر ایک مسلمان نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ بڑی مشکل سے 'آغا جبد' اور مولوی سلیمان صاحب کے سمجھانے بجھانے سے کوئی پانچ سات آدمی شریک ہوگئے اور اس طرح مغرب سے پہلے پہلے اس بدبخت کا جنازہ "قدم شریف" میں پہنچا اور رات کے اندھیرے میں جب روشنی بھی برائے نام تھی گورکنوں نے اوندھا سیدھا دبا دیا۔ اس کی موت نے ساری دلّی کو سبق دیا اور مدتوں اس کا چرچا شہر کے بچہ بچّہ کی زبان پر رہا۔

اس کی مچھاتی لاش پر چاروں طرف سے لعنت برس رہی تھی اور اگر دو چار آدمی بیچ بچاؤ نہ کرتے تو خدا معلوم اس کا کیا حشر ہوتا۔ شاید شہر والے بکا بوٹی کر ڈالتے۔ بڑے بھائی کی جو شامت آئی تو بھول کر بیٹھا۔ لیکن شہر والے تو درکنار محلہ کا بھی کوئی آدمی جا کر نہ پھٹکا اور پھاٹک حبش خاں" میں مولوی احمد اللہ صاحب کا یتیم خانہ تھا سارا کھانا وہاں بھیجا مگر انھوں نے بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اب نہ معلوم کتّوں نے کھایا۔ یا بلیّوں نے، بہرحال اس کی موت کا وہ حشر ہوا کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔

میلہ کے بعد

شہر میں اب امّی جمّی تھی مگر دلّی والوں کے دل بادشاہ کے ساتھ اس اطمینان کو رو رہے تھے جو غدر سے پہلے نصیب تھا۔ گوروں کے رعب کی یہ کیفیت

تھی کہ اگر دور سے صورت نظر آجاتی تھی تو بعض اللہ کے بندے کانپ جاتے تھے

غدر کے بعد جو انقلاب ہوا وہ ایسا نہ تھا کہ دلّی اس کو آسانی سے فراموش کر دیتی۔ ہزاروں کھاتے پیتے دو دو دانوں کو محتاج ہو گئے۔ جن کے گھروں پر گھوڑے بندھے ہوئے تھے ان کو روٹی تک نصیب نہ تھی۔ جمنا ان بدنصیبوں کا پیٹ بھی بھر رہی تھی اور دل بھی بہلا رہی تھی۔ صبح اُٹھے اور مچھلی کی ڈور کانٹے لئے اور دریا پر پہونچ گئے۔ کوئی رات کی بچی بچائی باسی کوسی روٹی بغل میں ماری دو چارپان کے ٹکڑے۔ بیڑی کا حقہ ساتھ لیا اور وہیں شام کردی۔ اگر کوئی مچھلی مل گئی تو فبہا محلہ بھر میں عید ہوگئی۔ کچھ بیچی کچھ بانٹی کچھ کھائی کچھ رکھی۔ نہ ملی تو چپکے سے آ کچھ موجود ہوا تو کھا کر ورنہ فاقے سے چپکے سے پڑ رہے۔

شہزادوں کا یہ خاندان غدر کے بعد کچھ شادی بیاہوں کے اور کچھ کام کے سلسلہ میں منتشر ہو کر دوسرے شہروں میں پہونچ گیا۔ یہ جس وقت کا ذکر ہے اس وقت دلّی شہزادوں سے کھچاکھچ بھری ہوئی تھی مگر افلاس نے ایسی بُری گت بنادی تھی کہ روٹی تھی تو کپڑا نہ تھا اور کپڑا تھا تو روٹی نہ تھی۔

دلّی میں جو میلے اس سے پہلے ہوئے وہ میں نے نہیں دیکھے مگر اس کے بعد میلے بھی دیکھے دربار بھی دیکھے، جلسے اور محفلیں بھی دیکھیں۔ لیگیں اور کانفرنسیں بھی دیکھیں مگر جو صورتیں میلے میں نظر آگئیں وہ تو پھر کیا نظر آتیں، اُن جیسی بھی دیکھنے میں نہ آئیں! ہاں پھول والی بیگم جب تک زندہ رہیں ان کی لہکار اور اُن کے پھولوں کی مہکار وہ سماں یاد دلاتی رہی۔

برجیس دولہن جو اس میلے کی جان اور گوہر آرا بیگم جو اس برات کی دولہن تھیں بہت روز تک زندہ رہیں برجیس دولہن کلاں محل کے پاس

رہتی تھیں مگر گوہر آرا بیگم اپنی نند کے ساتھ سلطان جی چلی گئیں تھیں کبھی کبھی پھول والی بیگم کے ہاں ان شہزادیوں کا جمگھٹا ہوجاتا تھا۔ عید اور بقرعید پر سب کی سب پھول والی بیگم کے ہاں جمع ہوتی تھیں اور رنگ رلیاں مناتی تھیں قطب میں بھی "اندھیری باغ" میں ایک برسات میں نے اس میلے کے سات یا آٹھ سال بعد شہزادیوں کی دیکھی ہے۔ جھولے پڑے ہوئے تھے اور آم جامنوں کی جھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کڑھائیاں چڑھی ہوئی تھیں اور پینگیں بڑھ رہی تھیں۔ پھول والی بیگم، جس وقت جھولے میں بیٹھی تھیں سلطانہ بیگم اور برجیس دولھن جن کے ساتھ اور بہت سی بیبیاں تھیں جھولا جھول رہی تھیں۔ پھول والی بیگم نے جس وقت یہ ملہار شروع کیا ہے۔

"جھلوا جھلاتے ناگن ڈس گئی"

تو باغ گونج اٹھا تھا۔ شام تک چہل پہل رہی گوہر آرا بیگم کو میں نے اس کے بعد نہیں دیکھا۔ سنا ضرور کہ زندہ ہیں اسی طرح برجیس دولھن بھی پھر نظر نہ آئیں ہاں پھول والی بیگم کی صدا روز رات کو بلند ہوتی تھی۔ وہ کبھی کبھی جب جی چاہتا تھا، تو خود ہی بادشاہ کی کوئی غزل الاپتی تھیں مگر جہاں انھوں نے غزل شروع کی اور دو کان کے آگے بھیڑ لگی، رات کے سناٹے میں شاید ہی کوئی ایسا سنگ دل ہوتا ہوگا جس کے کلیجہ میں بیگم کی آواز نہ گھستی ہو۔

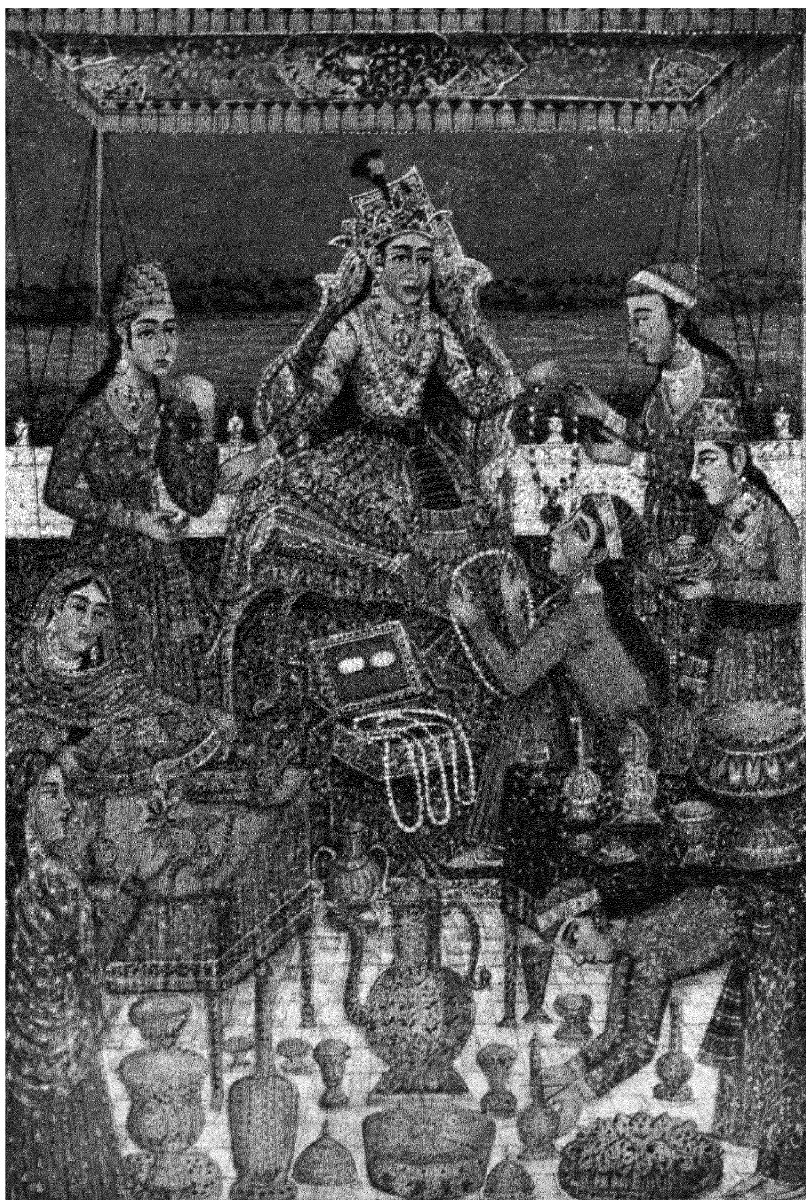
افسوس یہ ہے کہ بیگم کے سوا جن کو سرکار سے کچھ نہ ملتا تھا باقی اور سب شہزادیوں کی جن کو ماہانہ وظیفہ مل رہا تھا۔ حالت نہایت ردی تھی۔ ٹھیک یاد نہیں مگر گوہر آرا بیگم کے ہاں سب مل جل کر پچاس روپیہ سے کم کا وظیفہ نہ ہوگا مگر ان کے ننّوئی اور دیور بھنگ، چرس، چنڈو، کبوتر، مرغ، گلدم، ہر رنگ میں رنگے تھے یقینی طور پر تو کہنا مشکل ہے مگر گمان غالب ہے کہ مہینہ میں ایک آدھ فاقہ ضرور ہوتا ہوگا۔

بوا قمراً

گوہر آرا بیگم کی بھتیجی قمراً جس کو انھوں نے بیٹی بنا لیا تھا پہلی بیوی کے مرجانے کے بعد سلطان دولہا سے بیاہی گئی۔ یہ سب ہی گنوں پورے تھے۔ لمبی سفید ڈاڑھی تھی مگر چوک پر روزانہ کبوتر ہاتھ میں لئے موجود ہوتے تھے ٹوپی تو چکٹ ہوتی تھی، مگر ہوتی وہی شاہانہ تھی۔ میں نے ان کو چوک پر لیتڑے پہنے اور ننگے پاؤں پھرتے دیکھا ہے۔ گوہر آرا بیگم اور سلطان دولہا کے بعد اس لڑکی قمر کی حالت بہت ابتر ہوگئی۔ بچہ نہ تھا اور اس قابل بھی نہ رہی تھی کہ نکاح کر لیتی۔ چالیس پینتالیس برس کی عمر ہوگی مگر افلاس نے قبل از وقت بڑھاپے کے ڈیرے ڈال دیئے تھے وہ پھرتی پھراتی میرے ماموں کے ہاں ماماگیری کے واسطے آئی اور ایک روپیہ مہینہ اور روٹی پر نوکر ہوئی۔ اس کی عمر غدر میں سات آٹھ برس کی ہوگی مصائب کے تمام پہاڑ اس کے سر سے گذر چکے تھے۔ خاندان تیموریہ کی تباہی و بربادی میں وہ برابر کی شریک تھی اور اس کی زندگی بتا رہی تھی کہ کس طرح سیجوں پر سونے والیاں خاک میں اٹتی ہیں!

رات کے وقت جب بوا قمراً جن کو بچے خالہ خالہ کہتے تھے کام کاج سے فارغ ہو جاتیں تو ان کے پاس جا بیٹھتے اور وہ غدر کی داستانیں اس طرح سناتیں کہ بعض دفعہ بڑے بوڑھے بھی شوق سے سنتے۔ انھوں نے اپنی آنکھ سے ایسے خاندانوں کی بربادی دیکھی تھی کہ سنکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اور میری رائے میں تو وہ خود بھی انقلاب کی پوری تصویر تھیں۔ اُن کا پھٹا ہوا برقع اور ٹوٹی ہوئی جوتی اُس وقت تو نہیں مگر آج عالم تخیل میں میرے واسطے درس عبرت ہے۔ {شروع مئی ۲۹ء ختم جنوری ۳۲ء}

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی



مینا بازار



دیکھئے صفحہ ۱۴